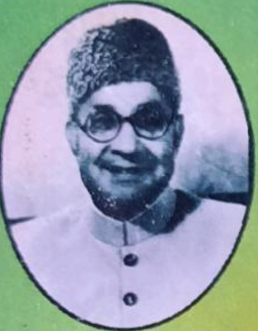
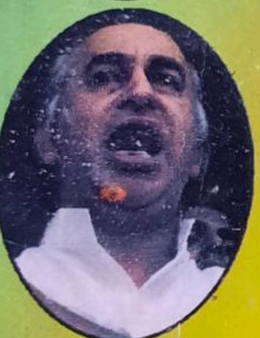

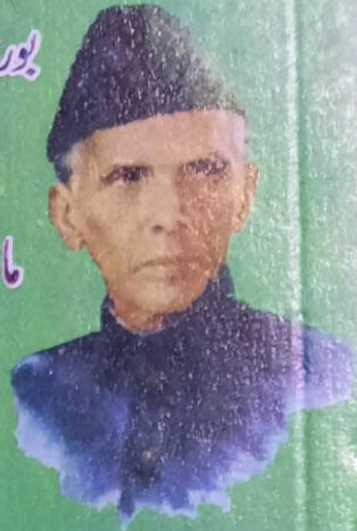

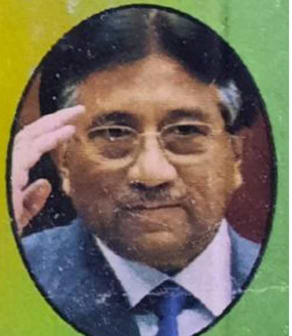
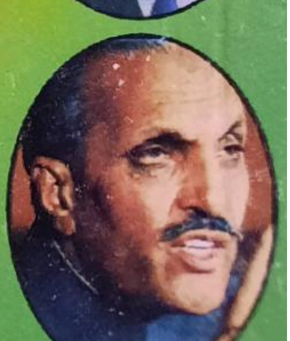

بورڈ آف انٹرمیڈیٹ کے نصاب کے مطابق

جدید نصاب کے مطابق (MCQs)

ماڈل پیپرز کیساتھ

رہنمائے امتحانات

(پاکستان اسٹڈیز)

برائے بارہویں جماعت

(سائنس، آرٹس، کامرس)

ترتیب وتالیف

پروفیسر آصف اقبال ظہوری

0333-2653460

PAKISTAN STUDIES (GOLDEN PAPER-I)

For Higher Secondary Classes (XII)

By: Asif Iqbal Zahoori (Lecturer in Pakistan Studies)

Marks Detail: MCQs (10) = 10 (Each 1)	**Total Marks. 50** (کل نمبر)
Short Question: 06 = 24 (Each 4)	Time Allowed: 2 hours (وقت)
Descriptive: 02 = 16 (Each 8)	

(حصہ اول معروضی سوالات)

SECTION-A (MCQs)

Note: Attempt all question, carry equal Marks. (MCQs)

(1) انڈیا کا آخری وائسرائے کون تھا

Q1. The last viceroy of India was:
a. Lord Curzon b. **Lord Mount Batten** c. Staford Cripps

(2) پاکستان اقوام متحدہ کا ممبر کب بنا؟

Q2. Pakistan became member of united nations on:
a. 30 Dec 1948 b. 30 Dec 1949 c. **30 Dec 1947**

(3) قرارداد مقاصد کب پاس ہوئی؟

Q3. The objective resolution was passed on:
a. 12 March 1950 b. **12 March 1949** c. 12 March 1951

(4) اسٹیٹ بینک کا افتتاح قائداعظم نے کب کیا؟

Q4. The State Bank of Pakistan was inaugurated by Qauid-e-Azam in:
a. **July 1948** b. July 1950 c. June 1952

(5) پاکستان کا پہلا آئین کب نافذ ہوا؟

Q5. The First constitution of Pakistan came into force in:
a. **23rd March 1956** b. 23rd March 1962 c. 3rd March 1973

(6) شملہ وفد کی قیادت کس نے کی تھی؟

Q6. The Simla Deputation was headed by:
a. Qauid-e-Azam b. **Sir Agha Khan** c. Allama Iqbal

(7) لکھنؤ معاہدہ کب ہوا تھا؟

Q7. The Lucknow pact was signed in:
a. 1919 b. 1929 c. **1916**

(8) قائداعظم نے چودہ نکات کب پیش کئے

Q8. Qauid-e-Azam proposed his famous 14 points in:
a. **1929** b. 1930 c. 1940

(9) پاکستان کا پہلا صدر کون تھا؟

Q9. The First president of Pakistan was:
a. Parvez Musharaf b. Asif Ali Zardari c. **Iskadar Mirza**

(10) سندھ مسلم لیگ نے قرارداد پاکستان کب منظور کی؟

Q10. Sindh Muslim league passed resolution in:
a. 1940 b. **1938** c. 1946

انتساب

مطالعہ پاکستان کے ان اساتذہ کرام کے نام جن کے شبانہ روز تحریک پاکستان کے اکابرین، نظریہ پاکستان کی حفاظت اور طلبہ کی تعمیری اور تخلیقی صلاحیتوں میں صرف ہوتے ہیں۔ ساتھ ساتھ وہ زندہ دلان پاکستان جو پاکستان کی حرمت و تقدس اور اس مٹی کی پاکیزگی پر اپنا تن، من دھن قربان کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔

اس دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ پاکستان اور اس کی قوم کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔

پروفیسر آصف اقبال ظہوری

PAKISTAN STUDIES (GOLDEN PAPER-II)

For Higher Secondary Classes (XII)

By: Asif Iqbal Zahoori (Lecturer in Pakistan Studies)

Marks Detail: MCQs (10) = 10 (Each 1)
Short Question: 06 = 24 (Each 4)
Descriptive: 02 = 16 (Each 8)

Total Marks: 50
Time Allowed: 2 hours

SECTION-A (MCQs)

Note: Attempt all question, carry equal Marks. (MCQs)

Q1. The Muslim league celebrated "Direct Action Day" on:
a. **16 Aug 1946** b. Aprile 1945 c. June 1947

Q2. The Second Round Table Conference took place in:
a. 1930 b. **1931** c. 1932

Q3. Qauid-e-Azam was born in:
a. **25th Dec 1876** b. 25th Dec 1877 c. 25th March 1885

Q4. The last Mughal emperor was:
a. Akbar the great b. Orangzaib c. **Bhadur Shah Zafar**

Q5. Congress was founded in the year:
a. **1885** b. 1881 c. 1861

Q6. Cabinet Mission Visited India in:
a. 1942 b. **1946** c. 1940

Q7. India Independence act was announced in:
a. June 1947 b. **July 1947** c. Aug 1942

Q8. The heigh court of Pakistan in:
a. Session Court b. High Court c. **Supreme Court**

Q9. Minto-Morley reform were given in the year:
a. 1919 b. **1909** c. 1935

Q10. Simon commission visited India in the year:
a. 1929 b. 1931 c. 1927

PAKISTAN STUDIES (GOLDEN PAPER-II)

For Higher Secondary Classes (XII)

By: Asif Iqbal Zahoori (Lecturer in Pakistan Studies)

SECTION-B (SHORT QUESTIONS)

Note: Attempt any Six question, carry equal Marks. (Total Marks 6*4 =24)

Q2. Define Ideology and Ideology of Pakistan?

Q3. Writ ea short note on Simla Deputation?

Q4. Comments on Nehro Report & fourteen points of Muhammad Ali Jinnah?

Q5. Khilafat Movement & its Major impact on Indian Politics?

Q6. Geo-Political importance of Pakistan?

Q7. Proposals of Cabinet Mission Plan 1946?

Q8. Urdu as a National language of Pakistan?

Q9. Write a short note on energy crises of Pakistan?

Q10. Powers of president of Pakistan?

SECTION-C (DESCRIPTIVE QUESTIONS)

Note: Attempt any Two question, carry equal Marks. (Total Marks 2*8 =16)

Q11. Political & education services of Sir Syed Ahmed khan (Ali Garh Movement?

Q12. Two Nation theory in the light of the statement of Quaid-e-Azam & Allama Iqbal?

Q13. Pakistan relation with U.S.A. India, china & Afghanistan?

نمبر شمار	فہرست مضامین	صفحہ نمبر	نمبر شمار	فہرست مضامین	صفحہ نمبر
1	اسلام سے قبل جنوبی ایشیاء کے حالات	1	24	قائد اعظم جناح مذاکرات 1944	54
2	جنوبی ایشیاء میں ذات پات کا نظام	3	25	ویول پلان 1945	54
3	جنوبی ایشیاء میں اسلام آنے کے بعد کے اثرات	4	26	شملہ کانفرنس 1945	55
4	دو قومی نظریہ	7	27	عام انتخابات 1945-1946	56
5	قائد اعظم اور نظریہ پاکستان	9	28	دہلی کنونشن 1946	56
6	قومی زندگی میں نظریہ پاکستان کی اہمیت	13	29	عبوری حکومت کا قیام 1946	56
7	قیام پاکستان کے اغراض و مقاصد	14	30	راست ایکشن 1946	56
8	صوبوں میں آزادی کی جدوجہد (اقلیتی صوبے)	17	31	3 جون کا منصوبہ 1947	56
9	مسلم لیگ کا قیام	28	32	قانون آزادی ہند 1947	57
10	تقسیم بنگال	22	33	ریڈکلف ایوارڈ 1947	58
11	شملہ وفد	24	34	پاکستان کے ابتدائی مسائل	59
12	لکھنو معاہدہ (پس منظر و اہمیت)	27	35	مسئلہ کشمیر	64
13	تحریک خلافت (پس منظر، نتائج و اثرات)	30	36	قرارداد مقاصد 1949 (خصوصیات و اہمیت)	67
14	تجاویز دہلی	34	37	1956 کا دستور (خصوصیات و اسلامی دفعات)	70
15	نہرو رپورٹ (پس منظر و اہمیت)	33	38	1962 کا دستور (خصوصیات و اسلامی دفعات)	73
16	چودہ نکات (پس منظر و اہمیت)	38	39	اسلامی نظریاتی کونسل کے فرائض	78
17	پہلی، دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس	40	40	1973 کا دستور (خصوصیات و اسلامی دفعات)	76
18	خطبہ الہ آباد کی اہمیت	42	41	پاکستان میں نظام اسلام کی کاوشیں	81
19	کانگریسی راج میں مسلمانوں کے حالات	46	42	پاکستان کا محل وقوع اور اسکی اہمیت	84
20	قرارداد لاہور (پس منظر و اہمیت)	49	43	پاکستان کی آب و ہوا اور خطے	85
21	اگست آفر 1940	53	44	پاکستان کی قدرتی خطوں میں تقسیم	88
22	کرپس تجاویز 1942	54	45	پاکستان کے معدنی وسائل	91
23	ہندوستان چھوڑ دو تحریک 1942	54	46	کلچر و ثقافت کی تعریف	95

PAKISTAN STUDIES (GOLDEN PAPER-II)

For Higher Secondary Classes (XII)

By: Asif Iqbal Zahoori (Lecturer in Pakistan Studies)

SECTION-B (SHORT QUESTIONS)

Note: Attempt any Six question, carry equal Marks. (Total Marks 6*4 =24)

Q2. Formation of All India Muslim league in 1906?

Q3. Give an account on division of Bengal 1905?

Q4. Give Comments on Lucknow Pact 1916?

Q5. Role of Congress ministries in 1937?

Q6. What were the silent features of "Lahore Resolution"?

Q7. What were the proposals of Cripps Mission?

Q8. Discus 3rd June Plan and Indian independence act 1947?

Q9. Early problems of Pakistan?

Q10. Importance of objective Resolution 1949?

SECTION-C (DESCRIPTIVE QUESTIONS)

Note: Attempt any Two question, carry equal Marks. (Total Marks 2*8 =16)

Q11. Pakistan as an Islamic democratic state in the light of the statement of Qauid-e-Azam?

Q12. Political and constitutional history of Pakistan from 1940 to 1947?

Q13. Write a short note on any two of the following?

a. Powers of Supreme Court.
b. Islamic provision of 1973 constitution.
c. Pakistan as a Atomic power.

نمبر شمار	فہرست مضامین	صفحہ نمبر	نمبر شمار	فہرست مضامین	صفحہ نمبر
47	وادی سندھ کی تہذیب واثرات	96	70	ترکی اور پاکستان کے تعلقات	139
48	گندھارا ثقافت واثرات	96	71	مصر اور پاکستان کے تعلقات	140
49	پاکستان کا ثقافتی ورثہ	98	72	امریکہ کے ساتھ تعلقات	152
50	مسلم عہد حکومت کا ثقافتی ورثہ	106	73	روس کے ساتھ تعلقات	152
51	پاکستانی کلچر اور اس کے خدوخال	99	74	چین کے ساتھ تعلقات	154
52	اردو کی قومی زندگی میں اہمیت	108	75	اقوام متحدہ کا قیام، مقاصد اور اہمیت	145
53	پشتو زبان	110	76	اقوام متحدہ کے ادارے	146
54	سندھی زبان	111	77	غیر وابستہ ممالک	149
55	پنجابی زبان	112	78	علاقائی تعاون برائے ترقی تنظیم	150
56	بلوچی زبان	113	79	اسلامی کانفرنس کی تنظیم	150
57	مقامی زبانوں کے ادب پر اثرات	114			
58	قومی یکجہتی میں اردو کا کردار	115			
59	پاکستان کی معاشی منصوبہ بندی اور اس کی اہمیت	116			
60	پاکستان کی دیہی ترقی اور زراعت کا معیشت میں کردار	123			
61	زرعی پسماندگی کے حل کے لئے تجاویز	123			
62	پاکستان کی صنعت کی اہمیت	124			
63	صنعتی پسماندگی کے اسباب اور مشکلات	125			
64	پاکستان کی اہم صنعتیں	132			
65	پاکستان میں تعلیم کے مواقع اور اہمیت	133			
66	پاکستان کے تعلیمی مسائل	134			
67	پاکستان کی خارجہ پالیسی کے اصول و بنیادیں	41			
68	سعودی عرب اور پاکستان کے تعلقات	137			
69	ایران اور پاکستان کے تعلقات	138			

اسلام سے قبل جنوبی ایشیاء کے حالات

(د) مذہبی حالات :-

جواب : جنوبی ایشیا میں اسلام سے پہلے سیاسی اقتصادی معاشرتی اور مذہبی حالات انتشار اور ابتری کا شکار تھے جن کا مختصر جائزہ درج ذیل ہے۔

(الف) سیاسی حالات : اسلام کی آمد سے قبل برصغیر مختلف چھوٹی چھوٹی آزاد اور خود مختار ریاستوں میں بٹ چکا تھا۔ یہ ریاستیں تقریباً تمام راجپوتوں کے ماتحت تھیں اور ایک دوسرے سے لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ کشمیر' پنجاب کابل۔ سندھ و گجرات کاٹھیاواڑ' اجمیر اور دہلی کی ریاستوں پر مختلف راجپوت خاندان کے افراد قابض تھے۔ ریاست بندھیل کھنڈ پر پنڈیل کا تسلط تھا۔ ریاست میواڑ پر سیسودیہ خاندان کی حکومت تھی۔ مالوہ پر مار خاندان حکمران تھا جن کا دارالخلافہ دھار تھا۔ مشرق میں نیپال' آسام اور بہار کی خود مختار ریاستیں تھیں اس کے علاوہ بنگال میں بھی سیاسی انتشار پھیلا ہوا تھا۔ یہاں سوپال اور سین خاندان کی حکومت تھی۔ دکن میں واشٹرکوٹ اور وید خاندان یکے بعد دیگر حکومت کر رہے تھے۔ اس زمانہ میں تمام سلطنتوں میں شخصی نظام حکومت رائج تھا۔ سیاسی انتشار کی وجہ سے کوئی سیاسی نظام یا مضبوط مرکزی حکومت قائم نہ ہو سکی تھی۔

(ب) اقتصادی حالات : عام لوگوں کا پیشہ زراعت اور کھیتی باڑی تھا۔ بارش کے علاوہ آبپاشی دریاؤں اور بندوں تالابوں سے بھی کی جاتی تھی۔ تجارت بھی مقبول تھی جس کی وجہ سے بیرونی ممالک کے ساتھ بھی تجارتی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ ہیون سانگ کے بیان کے مطابق گجرات کاٹھیاواڑ کے لوگ بحری تجارت کرتے تھے۔ اجین تجارت کا مرکز تھا۔ یوں مجموعی طور پر جنوبی ایشیا مالی طور پر بہرحال آسودہ تھا۔ اور ایسی کوئی صورت حال نہ تھی جسے معاشی بدحالی سے موسوم کیا جاسکے۔

(ج) معاشرتی حالات : معاشرہ جن چار درجوں میں تقسیم تھا وہ برہمن کھتری ویش اور شودر تھے۔ اس درجہ بندی نے معاشرہ کو اس طرح منتشر کر رکھا تھا کہ ہر حصہ ایک جداگانہ طرز زندگی رکھتا تھا اور ان چاروں میں اشتراک عمل و فکر کا کوئی سوال نہ تھا۔ تاہم معاشرہ میں

برہمنوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی ان کی ہر جگہ عزت کی جاتی تھی۔ برہمنوں کے ہا
اچھوتوں کی تنظیم و توقیر ہوتی تھی۔ ابتداء میں ہندوستانی سماج صرف چار فرقوں میں تقسیم تھی
لیکن مسلمانوں کے آمد کے وقت ذاتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بیرونی ممالک کے حملہ آور کی آ
سے نئی نئی ذاتیں پیدا ہو گئی تھیں اور ذات پات کی بندش سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔ نیچ ذاتوں
ساتھ ملنا جلنا بھی ممنوع تھا۔ بعض اوقات تو ان کا سایہ بھی انسان پر پڑنا ناپاک تصور کیا جا
تھا۔ اس وقت بہت سی رسومات رائج تھیں جن میں کئی ایک رامائن اور مہابھارت کے زمانہ
کی تھیں۔ یعنی ذاتوں کی قید کی طرح وقت کے ساتھ سخت تر ہوتی جاتی تھی۔

طبقہ نسواں کی بدحالی معاشرت کا اہم پہلو تھی عورت کی حیثیت خادمہ سے زیادہ نہ تھی
اسے مذہبی کاموں میں حصہ لینے کی اجازت تک نہ تھی شوہر کے مرنے پر عورت کو معاشرہ کا غیر
ضروری حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ معاشرتی طور پر ہی عیش پسندی کا رجحان بھی بہت نمایاں تھا
موسیقی اور ناچ میں خاص دلچسپی لی جاتی تھی۔ تصویر کشی بھی عام تھی اور چونکہ اقتصادی خوشحالی
موجود تھی اس لئے عیش و عشرت کا بازار گرم تھا جس کے منفی اثرات بہرحال معاشرے پر پڑ
تھے۔

(د) مذہبی حالات : اس زمانہ میں بدھ مت جین مت اور ہندومت رائج تھے۔ ان کے
درمیان دشمنی اور رقابت کے جذبات پائے جاتے تھے۔ لیکن اس وقت بدھ مت کو زوال آ
تھا اور ہندومت عرصہ تک گمنامی میں رہنے کے بعد ترقی کی کوشش کر رہا تھا۔ جین مذہب صرف
چند لوگوں میں مقبول تھا۔ ان تینوں مذاہب میں سے ہر ایک کے متعدد فرقے بن گئے تھے۔ چنا
دسویں عیسوی میں یہاں تقریباً چار سو پچیس فرقے موجود تھے۔ بدھ مت جو کسی وقت کنشک
اور اشوک جیسے نامور حکمرانوں کی سرپرستی میں تھا اپنا عروج و وقار کھو رہا تھا۔ جہاں تک
ہندوستان کا تعلق تھا سوسائٹی کی اجارہ داری برہمنوں کے ہاتھ میں تھی ان برہمنوں نے مذہ

طور پر سخت اور پیچیدہ رسموں کو رواج دے رکھا تھا۔ اور بعض ایسے نظریات بھی پیدا کر دئے تھے جو خود معاشرہ کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتے تھے مثلاً راجہ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی غرض سے کافی روپیہ مذہبی معاملات پر خرچ کروایا کرتے تھے۔ ہر وہ چیز جو نفع نقصان پہنچا سکتی تھی ہندومت میں دیوتا کا درجہ رکھتی تھی۔ دیوتاؤں کو راضی رکھنے اور ناراضگی دور کرنے کے لیے پوجا کا طریقہ بہت دشوار تھا۔ مذہب پر برہمنوں کی مکمل اجارہ داری تھی۔ مذہبی علم صرف برہمن حاصل کر سکتے تھے اور کوئی بھی رسم بغیر برہمن کے ادا نہیں ہو سکتی تھی۔

برصغیر جنوبی ایشیا میں ذات پات کا نظام

جواب : ہندو معاشرہ چار ذاتوں میں تقسیم تھا۔ برہمن سب سے اونچی ذات تھی جو ہندو عقیدے کے مطابق برہما دیوتا کے سر سے پیدا ہوئی تھی۔ برہمن کا کام دیوتاؤں کی عبادت کرنا اور مذہبی امور کا فیصلہ کرنا تھا۔ کشتری دوسرے درجہ کی ذات تھی اس کا فرض وحرم کی حفاظت جنگ اور حکومت کرنا تھا۔ ہندو عقیدے کے مطابق یہ لوگ برہما دیوتا کے بازوؤں سے پیدا ہوئے تھے۔ ویش برہما دیوتا کے پیٹ سے نکلے تھے۔ ان کا کام تجارت، زراعت اور معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینا تھا۔ شودر چونکہ ہندو عقیدے کے مطابق برہما دیوتا کے پاؤں سے پیدا ہوئے تھے اس لیے ان کا کام صرف خدمت کرنا تھا۔ پس یہ درجہ بندی سارے معاشرے کو منتشر کرنے کا ذریعہ ثابت ہوئی تھی اور معاشرہ کے ان مختلف درجوں کے درمیان کسی معاشرتی ہمواری کا موجود رہنا تقریباً ناممکن بنا دیا گیا تھا۔ ان کے لیے اونچی ذات کے آبادی میں رہنا ناجائز تھا۔ وہ ویدوں کو ہاتھ لگانا تو در کنار سن تک نہیں سکتے تھے اگر کوئی شودر کسی برہمن کی آواز سن لیتا تو سیسہ پگھلا کر اس کے کان میں ڈال دیا جاتا۔ جبر استبداد اور ظلم کی یہ فضا کمزور کو جینے کا کوئی حق نہ دیتی تھی۔ مثلاً رسومات کے ذریعہ شودر کی زندگی کو اس کے لئے انتہائی اجیرن اور دشوار بنا دیا گیا تھا۔

اس بیان سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اس دور میں جنوبی ایشیا میں رہنے والوں کو ذاتوں کی تقسیم کے سبب نہ آزادی فکر و عمل کے احساسات نصیب تھے اور نہ سماجی ترقی کی کوئی مشترکہ صورت ہی پیدا ہوئی تھی چنانچہ یہ معاشرتی ناہمواری نمایاں تھی

(الف) سیاسی (ب) مذہبی (ج) معاشرتی (د) علمی و ادبی

جواب : سیاسی اثرات : مسلم فاتحین پر یہ بات پوری طرح آشکار ہو گئی تھی کہ ہندوستانی حکمران متحد ہو کر مقابلہ نہیں کر سکتے اور معاشی عدم مساوات کی وجہ سے بدھ مت اور نچلی ذاتیں ہر حملہ آور کے ساتھ تعاون کو تیار ہیں۔ اس کے علاوہ ذات پات کی وجہ سے بلکہ کی دفاع کی ذمہ داری صرف ہندوؤں کی ایک ذات کشتریوں پر عائد ہوتی ہے۔ اس لیے ساری آبادی کے مقابلے پر آنے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ مسلمانوں نے یہاں آکر سیاسی انتشار کو ختم کیا اور ملک میں اندرونی امن و امان قائم کیا۔ برصغیر کو ایک مرکز کے تحت متحد کر کے مسلمانوں نے شمالی برصغیر کے وسیع علاقے میں ایک ہی نظام طرز نظام حکومت قائم کیا۔ برصغیر کے مسلمان ایک وسیع اسلامی معاشرے کا حصہ تھے۔ جس سے لاتعلق رہنا ناممکن تھا۔ چنانچہ یہاں کی قدیم اقوام پر اسلام کے براہ راست یا بالواسطہ اثرات کا قائم ہونا ایک فطری امر تھا پھر مسلمان اشاعت دین کی کوششوں کی بدولت دنیا کے مختلف ممالک سے آشنا تھے اور سیاسی بصیرت کے اہل بھی مسلمانوں کے بیرونی دنیا کے ساتھ اپنے سفارتی تعلقات قائم کیے۔ اس وجہ سے برصغیر دنیا سے واقف ہوا اور مسلمانوں کی آمد کے توسط سے جنوبی ایشیا کو دوسری اقوام سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔

مذہبی اثرات : مسلمانوں کی آمد سے قبل برصغیر کی مذہبی فضا تعصب اور تنگ نظری کا شکار تھی۔ مسلمانوں نے اس تعصب اور تنگ نظری کا خاتمہ کیا۔ اس سے پہلے برہمن ہی اعلیٰ طبقہ تصور کیا جاتا تھا۔ مذہب پر ان کی اجارہ داری تھی۔ ہندوؤں کی دیگر نچلی ذاتیں مذہب سے ناواقف تھیں۔ برہمن نچلی ذاتوں پر ظلم و ستم کرتے تھے۔ مسلمانوں نے یہاں آکر جہاں اپنے مذہب اسلام کے اصول ان لوگوں پر واضح کیے وہاں ہندوؤں اور نچلی ذات کے لوگوں کو مذہبی آزادی دی۔ اس آزادی نے انھیں اسلامی اقدار کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ یہ لوگ مسلمانوں کی رواداری، مساوات اور اخوت سے بہت متاثر ہوئے لوگ جوق

در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ مسلمان صوفیاء اور علماء کرام نے اسلام کی توسیع و اشاعت کی۔ داتا گنج، سلطان سخی سرور، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، خواجہ قطب الدین، بابا فرید گنج شکر، علاؤالدین، علی احمد صابر، نظام الدین اولیاء، چراغ دہلوی، شیخ بہاؤالدین ذکریا، رکن الدین، سید جلال الدین بخاری، لال شہباز قلندر وغیرہ نے برصغیر میں اسلام کی توسیع و ترویج کے لیے شاندار کارنامے انجام دیے۔

ان صوفیائے کرام نے سرکاری سرپرستی کے بغیر خاموشی سے اسلام کی تبلیغ جاری رکھی اور لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا کر اسلام کی تاریخ میں قابل تقلید کارناموں کا اضافہ کیا۔ ایک عرصہ دراز سے ایسی تنگ و تاریک مذہبی فضا میں کہ جو ظلم و استبداد سے عبارت تھی اسلام کی حق پسندانہ سرگرمیوں نے اپنا اثر دکھایا اور ہندومت کے ردعمل کے طور پر جو اثرات واضح ہوتے گئے انھیں بھگتی تحریک کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

بھگتی تحریک :۔

اگرچہ مسلمان بادشاہوں نے تبلیغ مذہب کے لیے کوئی خاص اقدام نہ کیا لیکن صوفیوں اور خدا رسیدہ اصحاب کی آمد سے اس ملک میں اسلام خوب پھیلا۔ اسلام توحید پرستی اور مساوات کا سبق دیتا ہے چنانچہ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندوؤں نے بھی یہی اصول اپنا لئے۔ اس کے علاوہ اسلامی تصوف نے بھی برصغیر کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا۔ مسلمان صوفیوں کی تقلید میں ہندوؤں نے بھی رواداری محبت اور اخوت کا سبق سیکھا۔ سلاطین دہلی کے آخری دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط سے ایک نئی قسم کا تصور پیدا ہوا۔ جسے بھگتی تحریک کہتے ہیں۔ اس تحریک کے بانی ہندو خدا پرست تھے۔ جن کے عقائد پر گہرے اسلامی اثرات واضح تھے۔ اس تحریک کا پیغام یہ تھا کہ مذہب آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا۔ تمام مخلوق سے بلا امتیاز مذہب و ملت اخلاق رواداری اور محبت سے پیش آنا چاہئے۔ بھگتی کا مفہوم ہندوؤں میں یہ تھا کہ ویدانت کے فلسفہ کے مطابق اور گیتا کی بنیادی تعلیم کے مطابق کسی انسان سے نفرت نہ کی جائے۔

معاشرتی اثرات : ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل ملاپ کی بدولت ایک نیا تمدن پیدا ہوا۔ معاشرتی تبدیلیوں کے زیر اثر ایک نئے تمدن کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ دونوں قوموں نے ایک دوسرے کے اثرات قبول کیے۔ مثلاً ہندو مذہب میں ذات پات کی شدت میں کمی

ہوئی۔ ہندو ایک یا دو ان سلے کپڑوں سے جسم کو ڈھانپا کرتے تھے مسلمانوں کی آمد سے سلے ہوئے لباس کا رواج ہوا۔ عطریات کا استعمال عام ہوا۔ ریشمی اور اونی کپڑوں کا استعمال ہونے لگا۔ تعمیرات کے لحاظ سے بھی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں ہندو تنگ و تاریک گھروں میں رہتے تھے مسلمان وسیع کشادہ اور ہوادار مکان میں رہتے تھے۔ یہ فرق ذہنی وسعت و تنگی سے تعلق رکھتا تھا۔ مسلمان وسیع النظر تھے اس لئے کشادہ اور ہوادار عمارتوں میں رہنا پسند کرتے تھے جب کہ ہندو قوم کی تنگ نظر تنگ و تاریک مکانوں میں رہنے کا عادی بنائے ہوئے تھی اس کے علاوہ ہندو خوارک کے معاملے میں اعلیٰ ذوق کے حامل نہیں تھے۔ مسلمانوں کی آمد سے ان کے خورد و نوش کے انداز بدل گئے۔ خاص طور پر عہد اکبری سے ایک اور خاص تبدیلی جو رونما ہوئی وہ یہ تھی کہ ہندو مسلم شادیوں نے رواج پایا۔ مسلمانوں نے ہندو عورتوں سے شادیاں کیں جس سے ہندو رسم و رواج مسلمانوں کے گھرانوں میں رائج ہو گئے۔

علمی و ادبی اثرات : اسلامی تعلیمات نے عورت کو معاشرے میں اہم مقام دیا۔ جس کے نتیجے میں ہندو عورتوں میں سمجھ بوجھ اور طلب علم کی توفیق پیدا ہوئی۔ ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد برہمنوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر اسلامی معاشرتی رواداری اور انصاف کے پرچم تلے سکون کا سانس لینے کے لیے جمع ہوئی۔ دونوں قوموں کے اختلاط سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی جسے اردو زبان کہتے ہیں۔ فنون جنگ میں ترقی ہوئی اور مسلمانوں کے اثر کی بدولت اس ملک میں تاریخ نویسی کا کام باقاعدہ طور پر شروع ہوا۔ مسلمانوں نے ہندو فلاسفی اور علم و ادب کا مطالعہ کیا۔ ہندو شاعروں نے اردو میں اور مسلمان شعراء نے ہندی میں شاعری شروع کی۔ اس سے دونوں کی ثقافتوں پر اثر پڑا۔ مسلمانوں نے یہاں ذرائع نقل و حمل میں بھی آسانیاں پیدا کیں نئی سڑکیں تعمیر کیں جس سے آمد و رفت میں سہولت پیدا ہوئی۔

مختصراً یہ کہ جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی آمد سے ایک نیا سیاسی، مذہبی اور معاشرتی و علمی معاشرہ جنم لینے لگا۔ ایک نیا تمدن ابھرنے لگا جو باہمی اثرات کا مظہر تھا۔ یہ ایک فطری عمل تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں نے ہی ایک دوسرے سے اثرات قبول کیے۔ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ ہندو قوم نے جو اثرات قبول کیے وہ افادیت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور رکھتے تھے جب کہ مسلم قوم نے جن ہندو روایات اور رسوم و رواج کو اپنایا وہ صرف ظاہری طور پر دلکش تھیں۔

"دو قومی نظریئے کی تعریف"

دو قومی نظریہ کی تعریف : دو قومی نظریہ کی تعریف سے پہلے نظریہ کی اپنی وضاحت ضروری نظر آتی ہے۔ نظریہ کسی بھی تحریک کی علمی اساس کو کہتے ہیں جو مشترکہ طور پر کسی جماعت گروہ یا قوم کا نصب العین ہو' وہ تحریک خواہ تہذیبی ہو' سیاسی ہو یا معاشرتی اس کے لیے جو بھی متفقہ لائحہ عمل بنتا ہے وہی "نظریہ" ہوتا ہے۔

نظریہ کے اس اپنے تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس حقیقت کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے کہ نظریہ ایک مسلسل ارتقاء کے بعد مستحکم ہوتا ہے اور مستحکم ہونے کے بعد ہی اسے کسی تحریک کی صورت حاصل ہوتی ہے۔

برصغیر کی تہذیب' معاشرت اور سیاست میں دو قومی نظریہ اس تحریک کا آغاز تھا کہ:۔

"برصغیر میں رہنے والی دونوں بڑی اقوام یعنی ہندو اور مسلمان جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں کوئی قدر مشترک نہیں"۔

یہ نظریہ اپنے ارتقائی انداز میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے دور سے آگے بڑھا اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے بہر لحاظ جدا جدا ہونے کا یہ احساس کہ جس نے دو قومی نظریہ کی بنیاد رکھی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جگایا۔

اس کے بعد اورنگ عالمگیر کی اسلامی پالیسی سے اسلامی معاشرے کے قیام تشخص کے دوام اور احیائے اسلام کی تحریک کو تقویت نصیب ہوئی اور پھر یہ سلسلہ آگے بڑھ کر حضرت شاہ ولی اللہ تک پہنچا اس سلسلہ میں پروفیسر خالد شبیر نے نہایت درست تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ پانی پت کی تیسری لڑائی جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ایماء پر لڑی گئی ہندوں اور مسلمانوں کے درمیان اس مقصد کے لئے تھی کہ مستقبل ہندوستان پر ہندو حکومت کریں گے یا مسلمان؟ فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا اور اس طرح ہندوستان کے مسلمان ایک مرتبہ پھر ایک ایسے معاشری

کی نذر ہونے سے بچ گئے جہاں ہندو مسلم فرق ختم ہو کر رہ جاتا چنانچہ یہ وہ دور تھا جب دو قومی نظریہ اور زیادہ واضح انداز میں سامنے آیا اس کے بعد شاہ ولی اللہؒ کے چاروں صاحبزادے بھی ہندوستان میں تحریک اسلامی کے اہم ستون رہے پھر سید احمد شہید نے اس تحریک کو کو جوش ولولہ' عزم وہمت کے ساتھ آگے بڑھایا' شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسماعیل شہید ان کے رفیق کار رہے اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے الفاظ میں شاہ ولی اللہ کی تجدید کا تتمہ ٹھرے ------ اور یوں یہ تحریک جس شخصیت کے ہاتھوں مکمل کر "دو قومی نظریہ" بنی وہ سرسید احمد خاں کی ذات تھی۔ سرسید نے ابتدائی طور پر تعلیمی اور معاشرتی فروغ کے لیے جو کوششیں شروع کیں ان کا رخ دونوں اقوام ہند (ہندو اور مسلم) کی طرف تھا۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم کی گئی سرسید اس وقت تک بھی مطمئن رہے کہ کہ شاید انگریزی قوت کو شکست دینے کے لیے ہندو اور مسلمان کی مشترکہ جدوجہد ہی موزوں ہے لیکن جیسے جیسے انہوں نے کانگریس کی سرگرمیوں کا قریب سے جائزہ لیا تو ان پر واضح ہوا کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ہیں کانگریس اور ہندو قوم زبان سے مسلمانوں کی ہمدرد نظر آتی ہے اور عمل سے اسلام اور مسلم قوم کی دشمن ثابت ہوتی ہے۔ سرسید نے کہا۔

"یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ ہندوستان میں جو مختلف ذاتیں' فرقے اور مذاہب کے افراد بستے ہیں وہ ایک قوم کے فرد ہیں۔ یا یہ کہ ایک قوم بن سکتے ہیں اور ان کے اغراض ومقاصد دینی اور ملی بھی ایک ہو سکتے ہیں میں سمجھتا ہوں یہ چیز قطعی ناممکنات میں سے ہے"۔

یہ وہ الفاظ تھے کہ جنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو اس فیصلہ تک پہنچایا کہ برصغیر جنوبی ایشیا میں ہندو اور مسلمان دونوں جداگانہ قومیں ہیں۔ سرسید نے برصغیر میں مخلوط طریقہ انتخاب کی بھی مخالفت بھی کی۔ جس کی وجہ یقیناً دو قومی نظریہ پر ان کا اعتقاد تھا انہوں نے اپنے رفقاء میں بھی اس نظریہ کو مضبوط کیا اور آنے والے دور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام اور خلاف تحریک وغیرہ اسی نقطہ نظر سے ہر شتہ اقدام ٹھرے اور اس کے بعد پروفیسر سلطان جہاں کے الفاظ میں سب نے دیکھا کہ برصغیر میں آہستہ آہستہ ابھرنے والا یہی دو قومی نظریہ مسلمانوں کا سیاسی اور معاشرتی نعرہ بن گیا۔

آخرکار اسی دو قومی نظریہ کی کوکھ سے نظریہ پاکستان نے جنم لیا۔ اب مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کی ایک منزل کا تعین کرلیا گیا اور اس تعین کے لیے جنوبی ایشیا کی مسلم تاریخ جن دو عظیم ناموں کی احسان مند رہے گی اور ان میں ایک نام علامہ اقبال کا ہے اور دوسرا بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظم کی بے مثال قیادت میں ہمارا کاروان منزل پاکستان تک پہنچا۔ مسلمانوں کے لیے جداگانہ مملکت کی جدوجہد کرنے والوں میں علامہ اقبالؒ قائداعظم کے علاوہ بقول پروفیسر محمد خلیل اللہ (مصنف تحریک پاکستان) کچھ اور مقتدر نام بھی ہماری تاریخ کا حصہ ہیں۔ اور ان میں علامہ جمال الدین افغانی۔ مولانا عبدالحلیم شرر' چوہدری رحمت علی اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ شامل ہیں۔

آج قیام پاکستان کے بعد یہ حقیقت اپنی جگہ ثابت ہو چکی ہے کہ ہم دس کروڑ مسلمانان (جنوبی ایشیا) ایک ایسی قوم ہیں جس کی اپنی مخصوص ثقافت' تمدن' زبان اور آرٹ کا سلسلہ' قدروں کا معیار' ادارتی اور قانونی نظام' رسم ورواج' روایات' صلاحیتیں اور مقاصد اپنی جگہ مثالی اور جداگانہ ہیں۔ اور زندگی کے متعلق ہمارا اپنا وہ مخصوص نظریہ ہے۔ جو مسلمان ہونے کے تعلق سے ہمارے حصہ میں آیا ہے۔

قائداعظم اور نظریہ پاکستان

قائداعظم نے جداگانہ قومیت کے تصور اور نظریہ پاکستان کی وضاحت کئی موقعوں پر کی۔ آپ کے ارشادات کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

مسلمان الگ قوم ہیں: ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں قرارداد پاکستان کے پیش کئے جانے سے ایک دن قبل آپ نے فرمایا:

"اسلام اور ہندو دھرم محض دو مذاہب ہی نہیں بلکہ درحقیقت دو مختلف معاشرتی نظام ہیں' چنانچہ اس خواہش کو خواب وخیال ہی کہنا چاہئے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک مشترکہ قومیت کی تخلیق کر سکیں گے' یہ لوگ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔ میں واشگاف الفاظ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ دو مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اکثر متصادم ہوتے رہتے ہیں۔ انسانی زندگی کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات اور تصورات

ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایسی دو قوموں کو ایک نظام میں باندھنے کا نتیجہ تباہی کی صورت میں نکلے گا۔ لہٰذا قوم کی ہر تعریف کی رو سے مسلمان ایک قوم ہیں، لہٰذا ان کے لئے الگ وطن چاہیے جہاں وہ اپنے عقائد کے مطابق معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی گزار سکیں۔"

حاکم اعلیٰ خدا ہے: ۱۹۴۱ء میں ایک موقع پر خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

"اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمارے سامنے رہنا چاہئے کہ اطاعت اور وفا کیشی کا اصل مرکز صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہت کی اطاعت ہے۔ نہ پارلیمان کی اور نہ کسی شخص یا ادارے کی۔ قرآن مجید کے احکام ہی سیاست اور معاشرے میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدیں قائم کرتے ہیں۔"

قرآن کی اہمیت: مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ کراچی ۱۹۴۳ء کے موقع پر قائداعظم نے قرآن مجید کی طرف رجوع کرنے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسم واحد کی طرح ہیں وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔ وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی کتاب قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔"

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے: جنوری ۱۹۴۸ء میں عید میلادالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر قائداعظم نے فرمایا:

"اسلام محض چند رسومات اور روایات کا مجموعہ نہیں بلکہ ہر مسلمان کے لیے مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اسلام سیاسی اور معاشی دونوں شعبوں میں ہماری راہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے اصولوں کی بنیاد احترام انسانیت، آزادی اور انصاف پر ہے۔ جو لوگ اس ملک میں یہ پراپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت اسلامیہ کے مطابق نہیں ہوگا۔ انہیں جان لینا چاہئے کہ شرعی قوانین آج بھی اسی طرح قابل عمل ہیں جس طرح تیرہ سو برس پہلے تھے۔"

اسلام کے لئے آزاد ملک کی ضرورت: مارچ ۱۹۴۴ء میں علی گڑھ میں خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

"آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا محرک اور مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کی وجہ کیا تھی۔ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کی وجہ ہندوؤں

کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔"

نومبر ۱۹۴۵ء میں سرحد مسلم لیگ کے اجلاس میں آپ نے فرمایا:

"ہمارا دین، ہماری تہذیب اور ہمارے اسلامی تصورات وہ اصل طاقت ہیں جو ہمیں آزادی حاصل کرنے کے لئے متحرک کرتے ہیں۔"

پاکستان کے حصول میں مسلمانوں اور اسلام کی بقا ہے: قائداعظم پاکستان کا وجود برصغیر کے مسلمانوں اور اسلام کی بقاء کے لئے لازم وملزوم سمجھتے تھے۔

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان مٹ نہ جائے تو اس کے لئے پاکستان نہ صرف یہ کہ ایک عملی نصب العین ہے بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے۔ یاد رکھئے اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تباہ ہو جائیں گے اور پھر اس برصغیر میں مسلمانوں اور اسلام کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔"

اسلامی تہذیب و تمدن کی حفاظت: اکتوبر ۱۹۴۷ء میں حکومت پاکستان کے افسران سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

"ہمارا نصب العین یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کی تخلیق کریں جہاں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں جو ہماری تہذیب و تمدن کی روشنی میں پھلے پھولے اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور کو پوری طرح پنپنے کا موقع مل سکے۔"

اسلام کے علاوہ کسی ازم کی ضرورت نہیں: مارچ ۱۹۴۴ء میں طلبا سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا:

"اسلام ہمارا راہنما ہے اور ہماری زندگی کا مکمل ضابطہ حیات ہے ہمیں کسی سرخ یا پیلے پرچم کی ضرورت نہیں اور نہ ہمیں سوشلزم، کیمونزم، نیشنلزم یا کسی دوسرے ازم کی ضرورت ہے۔"

رنگ و نسل کے تعصبات کی مخالفت: ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ میں آپ نے رنگ و نسل کے امتیازات کی مذمت کرتے ہوئے کہا:

"میں چاہتا ہوں کہ آپ بنگالی، سندھی، بلوچی اور پٹھان وغیرہ کی اصطلاحوں میں بات نہ کریں۔ کیا آپ وہ سبق بھول گئے ہیں جو تیرہ سو سال پہلے آپ کو سکھایا گیا تھا، یہ کہنے کا آخر کیا فائدہ ہے کہ ہم پنجابی ہیں، ہم سندھی ہیں پٹھان ہیں ہم تو بس مسلمان ہیں۔"

پاکستان میں اسلامی نظام نافذ ہوگا: اسلامیہ کالج پشاور کے طلباء سے ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے ارشاد فرمایا:

ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا بلکہ ہم

ایک ایسی تجربہ گاہ چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔"

فروری ۱۹۴۸ء میں ایک امریکی نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

"پاکستان کا دستور ابھی بننا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ جمہوری نوعیت کا ہوگا اور اسلام کے بنیادی اصولوں پر مشتمل ہوگا۔ ان اصولوں کا اطلاق آج کی عملی زندگی پر بھی اسی طرح ہو سکتا ہے جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھا۔"

اسلامی جمہوریت: ۱۴ جولائی ۱۹۴۷ء کو ایک پریس کانفرنس میں آپ نے فرمایا:

"جب آپ جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ آپ نے اسلام کا مطالعہ نہیں کیا ہم نے جمہوریت تیرہ سو سال پہلے سیکھ لی تھی۔"

۱۴ جنوری ۱۹۴۸ء کو سبی دربار میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے پاکستان کو ایک اسلامی جمہوریہ بنانے کی ہدایت کی۔

"میرا ایمان ہے کہ نجات کا واحد ذریعہ اس سنہری اصولوں والے ضابطہ حیات پر عمل کرنا ہے جو ہمارے عظیم قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے وضع کیا تھا ہمیں جمہوریت کی بنیادیں سچے اسلامی اصولوں اور تصورات پر رکھنی چاہیں۔"

اسلامی معاشی نظام: سٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

"اگر ہم نے مغرب کا معاشی نظام اپنایا تو ہمیں اپنے عوام کے لئے خوشحالی حاصل کرنے میں مشکلات درپیش ہوں گی۔ ہمیں اپنی تقدیر اپنے علیحدہ اور منفرد انداز میں بنانی پڑے گی۔ ہمیں دنیا کے سامنے ایک ایسا مثالی معاشی نظام پیش کرنا ہوگا جو انسانی مساوات اور معاشرتی انصاف کے سچے اسلامی اصولوں پر قائم ہو۔"

اقلیتوں کا تحفظ: قائداعظم نے پاکستان میں بسنے والی اقلیتوں کو تحفظ اور انصاف کا پورا یقین دلایا۔

"ہم ہندوؤں کو کامل یقین دلاتے ہیں کہ پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ اور برادرانہ سلوک کیا جائے گا۔ اس کے ثبوت میں ہماری تاریخ شاہد ہے اسلامی تعلیمات نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔"

ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا:

"ہم پاکستان میں تمام اقوام کا خیر مقدم کرتے ہیں جو پاکستان کی تعمیر و ترقی میں ہمارے ساتھ شریک ہونا چاہتی ہیں۔"

قائداعظم کے ارشادات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہماری قومیت کی بنیاد

دین اسلام پر ہے۔ اور یہ کہ مسلمانوں نے پاکستان کا مطالبہ اپنے عقائد و نظریات اور تہذیب و تمدن کی حفاظت و بقا اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنی زندگی گزارنے کے لئے کیا تھا گویا قائداعظم کی نگاہ میں اسلام اور پاکستان لازم و ملزوم تھے۔

قومی زندگی میں نظریہ پاکستان کی اہمیت

نظریہ پاکستان اور اسلام ہم معنی ہیں۔ اس لئے اسے ہماری قومی زندگی میں بے حد اہمیت حاصل ہے۔ یہ محض ایک نعرہ نہیں بلکہ ہمارے پورے نظام حیات کا عنوان ہے۔ ہمارے ملی وجود اور قومی تشخص کی پہچان نظریہ پاکستان سے ہی ہے۔ یہ ہماری انفرادی اور اجتماعی بقاء کا باعث ہے۔ اس پر عمل کئے بغیر ہمارا قومی وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ قائداعظم نے ۱۹۴۵ء میں عید کے موقع پر اپنے پیغام میں فرمایا:

"ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی تعلیمات محض عبادات اور اخلاقیات تک محدود نہیں بلکہ قرآن کریم مسلمانوں کا دین، ایمان اور ضابطہ حیات ہے۔ یعنی مذہبی، معاشرتی، تجارتی، تمدنی، عسکری اور تحریری احکام کا مجموعہ ہے۔ ہمارے رسول کریم ﷺ کا ہمیں یہ حکم ہے کہ اس کا بغور مطالعہ کریں تاکہ یہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی ہدایت کا باعث ہو۔"

۱۔ کامرانی کا مظہر: نظریہ پاکستان میں مسلمانوں کے لئے بڑی کشش پائی جاتی ہے۔ اس نے نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کو متحد کر کے ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا بلکہ ان کے اندر بے پناہ قوت فکر و عمل پیدا کی۔ جس کی بدولت انہوں نے ہندوؤں اور انگریزوں کا بڑی جرأت سے مقابلہ کیا اور ایک آزاد ملک حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اسی نظریہ پر کاربند رہ کر ہی ہم اپنے دشمنوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

۲۔ عظمت کردار کا موجب: پاکستان کے قیام کا بنیادی مقصد ایسی ریاست کا قیام تھا۔ جہاں مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اسلام کے اصولوں کے مطابق گزار سکیں تاکہ ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ وجود میں آجائے جس کے افراد 'باکردار' 'با اخلاق' اور جرأت مند ہوں۔ اس طرح نظریہ پاکستان عظمت کردار کی تعمیر کا ضامن ہے۔

۳۔ اتحاد عالم اسلام کی دعوت: نظریہ پاکستان کی بنیاد اسلام پر ہے۔ اور دین اسلام میں رنگ، نسل اور ملک کی تفریق بے معنی ہے۔ اس لحاظ سے یہ نظریہ عالم اسلام کے اتحاد کا مظہر ہے۔

۴۔ ملکی بقا کے لئے ناگزیر: ہمارا قومی نظریہ اس ملک میں بسنے والے مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والوں اور زبانیں بولنے والے لوگوں کے درمیان اتحاد اور یکجہتی پیدا کرنے کا موجب ہے۔ اس پر عمل پیرا ہو کر قومی اتحاد اور بقا کو استوار کیا جا سکتا ہے۔ اور انتشار پسند لوگوں کے عزائم کو مٹایا جا سکتا ہے۔ جو آغاز ہی سے اس کے خلاف سرگرم

عمل ہیں۔ ان حالات میں پاکستان کے استحکام اور بقاء کے لئے اس نظریہ کا تحفظ بہت ضروری ہے۔

۵۔ قوت کا سرچشمہ: ہمارا نظریہ حیات نہ صرف ہمیں اخوت و ایثار اور قربانی کا درس دیتا ہے بلکہ یہ ہمارے قومی وجود کے لئے قوت کا سرچشمہ بھی ہے۔ اسلام نے ہر آڑے وقت میں مسلمانوں میں بے پناہ قوت عمل پیدا کی۔ اور ان کے وجود کو ختم ہونے سے بچایا ہے۔ آئندہ بھی اس پر عمل پیرا ہو کر مسلمان دنیا کی قیادت حاصل کر سکتے ہیں۔

۶۔ دنیا و آخرت میں بھلائی کی ضمانت: کسی معاشرہ کی ترقی ایک مضبوط نصب العین کے بغیر ممکن نہیں۔ نظریہ پاکستان ہمیں ایسی ہی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ نظریہ دنیا میں ترقی کے ساتھ ساتھ آخرت کی بھلائی کی بھی ضمانت دیتا ہے۔

قیام پاکستان کے اغراض و مقاصد

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور نظریہ پاکستان پر عمل ہی اس کے استحکام اور ترقی کی ضمانت دے سکتا ہے۔ مسلمانان ہند نے کچھ خاص مقاصد کے پیش نظر بے شمار جانی اور مالی قربانیاں دے کر یہ ایک آزاد ملک حاصل کیا تھا۔ پاکستان کے حصول کا مقصد دراصل اس خطہ میں ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ قائم کرنا تھا جو اسلام کی تعلیمات پر مبنی ہو۔ مسلمانان ہند ایک ایسی سرزمین چاہتے تھے جہاں حاکمیت اعلیٰ صرف اللہ کی تسلیم کی جائے اور جہاں حکومت 'سیاست' معاشرت اور معیشت میں صرف اسی کا دیا ہوا نظام نافذ ہو۔ قائد اعظم کے فرمان کے مطابق

"ہمارا دین' ہماری تہذیب اور ہمارے اسلامی تصورات وہ اصل طاقت ہیں جو ہمیں آزادی حاصل کرنے کے لیے متحرک کرتے ہیں۔"

قیام پاکستان کے اغراض و مقاصد کو مندرجہ ذیل نکات کے ذریعے واضح کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی مملکت کا قیام: اسلام ایک جامع نظریہ زندگی کا نام ہے۔ اس میں اسلامی ریاست کے بارے میں تمام راہنما اصول موجود ہیں مسلمانوں کی ہمیشہ یہ دلی تمنا رہی ہے کہ اسلامی تعلیمات پر مبنی خلافت راشدہ کی طرز پر ایک حکومت قائم کی جائے۔ پاکستان کا قیام اسی آرزو کی تکمیل کی طرف پہلا قدم تھا چنانچہ قائد اعظم نے اس مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا

"ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔"

آزادی کی امنگ: اسلام اور غلامی یک جا نہیں ہو سکتے۔ اسلام کے اجتماعی نظام کے نفاذ کے لیے ایک آزاد اور خود مختار ملک کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اسلام اور

آزادی لازم و ملزوم ہیں قیام پاکستان کا مقصد مسلمانان ہند کے لیے ایک ایسے آزاد وطن کا حصول تھا جہاں وہ آزادی کی زندگی بسر کر سکیں
قائد اعظم کے الفاظ میں

"ہمارے دلوں میں آزادی کے لیے بے پناہ تڑپ ہے ہم برطانوی تسلط سے بھی رہائی چاہتے ہیں اور اس بات پر بھی رضامند نہیں ہو سکتے کہ ہمیں ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کی غلامی میں منتقل کر دیا جائے۔"

اسلامی معاشرے کی تشکیل: مسلمانوں کے نزدیک اسلام مغربی مفہوم میں محض مذہب ہی نہیں جس کا اطلاق فرد کی صرف ذاتی زندگی تک محدود ہے بلکہ اسلام اللہ اور بندے کے درمیان تعلق کو قائم کرنے کے ساتھ ساتھ انسانوں کے درمیان بھی حقوق اور تعلقات کو متعین کرتا ہے مطالبہ پاکستان کا ایک اہم محرک صحیح اسلامی معاشرے کا قیام تھا جہاں عدل و انصاف جمہوریت 'مساوات' اخوت اور سماجی بہبود کی بنیادی خوبیاں موجود ہوں اسلام کا ایک اپنا مخصوص معاشرتی اور معاشی نظام ہے جس پر عمل پیرا ہو کر قرون اولیٰ کے مسلم معاشرے کی خصوصیات پیدا کی جا سکتی ہیں اور ایک مثالی فلاحی ریاست قائم کی جا سکتی ہے۔

قومی تشخص کی حفاظت: مسلمان اور ہندو الگ الگ نظریات کی نمائندگی کرتے ہیں دونوں کے عقائد اور تہذیب و تمدن ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ہندوؤں میں سات صدیاں گزارنے کے باوجود مسلمانوں نے اپنا قومی تشخص برقرار رکھا ہندوؤں نے واردھا سکیم اور ودیا مندر سکیم جیسے تعلیمی منصوبوں کے ذریعے مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو ختم کرنے کی ایک منظم کوشش کی۔ مسلمانوں نے اس خطرے کو بروقت محسوس کر لیا اور انہیں یہ یقین ہو گیا کہ ان کے ملی تشخص کی بقا ایک علیحدہ ملک کے بغیر ممکن نہ ہو گی۔ قائد اعظم نے ایک موقع پر فرمایا

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کے لیے پاکستان نہ صرف یہ کہ ایک عملی نصب العین ہے بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے۔ یاد رکھیے اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تباہ ہو جائیں گے اور پھر اس برصغیر میں مسلمانوں اور اسلام کا نام و نشان مٹ جائے گا۔"

اسلامی تہذیب و ثقافت کا تحفظ: مسلمانوں کی اپنی بلند پایہ تہذیب و ثقافت تھی جس پر ان کو بجا طور پر فخر تھا انگریزی اقتدار میں ہندوؤں نے مسلم تہذیب و ثقافت کو تباہ کر کے اس کو ہندو تہذیب میں جذب کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ ہندو رسومات اختیار کرنے کے لئے غریب مسلمانوں پر بالخصوص معاشرتی دباؤ ڈالا جاتا تھا اس طرح مسلمانوں کو اپنا جداگانہ تشخص خطرے میں نظر آنے لگا۔ ان حالات میں اعلیٰ اسلامی

اقدار اور مسلم تہذیب و ثقافتی ورثہ کو بچانے کے لیے ایک آزاد ملک کا وجود ضروری تھا۔ قائداعظم نے فرمایا

"ہمارا نصب العین یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کی تخلیق کریں جہاں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں، جو ہماری تہذیب و تمدن کی روشنی میں پھلے پھولے اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور کو پوری طرح پنپنے کا موقع ملے۔"

ہندووانہ تعصب سے نجات: ہندو ایک تنگ نظر اور متعصب قوم ہے جو ہر دوسری قوم کو اپنے سے کم تر سمجھتی ہے۔ علاوہ ازیں ہندوؤں نے اپنے معاشرے کو چار طبقوں میں تقسیم کر کے آپس میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ مستقل نفرت کی بنیاد رکھ دی ہے۔ وہ مسلمانوں کو ملیچھ سمجھتے تھے جن کے چھونے سے ہندو ناپاک ہو جاتا تھا۔ ظاہر ہے ان حالات میں ہندو اکثریت کے درمیان مسلمانوں کا باوقار زندگی گزارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

پرامن فضا کا حصول: انیسویں صدی کے آخر میں ہندوؤں میں کئی انتہا پسند اور متعصب تحریکیں پیدا ہوئیں جن میں آریہ سماج خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آریہ سماج کا نعرہ تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ اس لئے مسلمان یا ہندومت قبول کرلیں ورنہ یہ ملک چھوڑ جائیں۔ اسی طرح ہندو مہاسبھا کی تنظیم بھی مسلمانوں کی سخت مخالف تھی۔ شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں کی وجہ سے جگہ جگہ ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے اور رفتہ رفتہ برصغیر میں امن و سکون ناپید ہو گیا۔ ان حالات میں مسلمانوں کو پرامن فضاء علیحدہ ملک کے سوا میسر نہ آسکتی تھی۔

اردو زبان کا تحفظ: ہندوؤں کا مسلمانوں کے خلاف نفرت کا سب سے پہلا اظہار ہندی اردو تنازعہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ حالانکہ اس زبان نے ہندوستان میں جنم لیا اور یہ دونوں قوموں کا مشترکہ تہذیبی ورثہ تھی۔ کانگرس نے اپنے دور اقتدار میں اردو کی بجائے ہندوستانی زبان رائج کرنے کی بھرپور کوشش کی جو دراصل ہندی کا نیا روپ تھا اور اس میں سنسکرت کے الفاظ کی بھرمار تھی۔ مسلمانوں کے اکثر علمی ذخائر اردو میں منتقل ہو چکے تھے۔ لہٰذا ان کے لئے اردو زبان کا تحفظ بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

معاشی استحصال سے نجات: انگریزوں کے آمد سے قبل مسلمان مالی لحاظ سے بہت خوشحال تھے۔ برطانوی اقتدار کے دوران ہندوؤں اور انگریزوں کی ملی بھگت سے مسلمان نہایت مفلس اور بدحال ہو گئے۔ ہندو آہستہ آہستہ صنعت و تجارت اور اعلیٰ ملازمتوں پر چھا گئے۔ غریب مسلمان اکثر ہندو بنیوں کے مقروض رہنے لگے۔ سندھ، سرحد اور بلوچستان جیسے مسلم اکثریت کے صوبوں کی ترقی کو خاص طور پر نظرانداز کیا گیا تھا۔ قیام پاکستان کا ایک اور اہم مقصد مسلمانوں کو ہندوؤں کے استحصال سے نجات دلانا اور ان کو ترقی و خوشحالی کی راہ پر گامزن کرنا تھا۔

عالم اسلام کا اتحاد: ہندوستان کے مسلمانوں نے ہمیشہ عالم اسلام کے مسائل کو اپنے مسائل سمجھا اور جہاں تک ممکن ہو سکا اپنے مسلمان بھائیوں کی مالی اور اخلاقی امداد کی اور ہر موقع پر ان سے اتحاد اور یگانگت کا اظہار کیا۔ قیام پاکستان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس ملک کو عالم اسلام کا قلعہ اور مرکز بنا دیا جائے تاکہ دوسرے مسلم ممالک اس سے راہنمائی اور قوت حاصل کر سکیں۔ چنانچہ قائداعظم نے قاہرہ میں ۱۹۴۶ء میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اس وقت تک مسلمان اور عرب حکومتیں حقیقی معنوں میں آزاد نہیں ہوں گی جب تک کہ پاکستان قائم نہ ہو گا۔"

قیام پاکستان کا تاریخی پس منظر

صوبوں میں آزادی کی جدوجہد

شمال مغربی سرحدی صوبہ: برطانوی حکومت نے ۱۹۰۱ء میں پنجاب کے پانچ اضلاع کو الگ کر کے انہیں شمال مغربی سرحدی صوبہ کا نام دیا اور یہاں دستوری اصلاحات نافذ کرنے کی بجائے پولیٹیکل ایجنٹوں کے ذریعے حکومت کی۔ ۱۹۲۷ء میں قائداعظم نے صوبہ سرحد میں اصلاحات نافذ کرنے کا مطالبہ کیا۔ جس کے بعد یہاں سیاسی اصلاحات کا نفاذ شروع ہوا۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں صوبہ سرحد کو دوسرے صوبوں کے برابر حیثیت حاصل ہو گئی۔

سرحدی صوبہ کی سب سے اہم سماجی اور سیاسی شخصیت سردار عبدالقیوم تھے۔ آپ نے ۱۹۱۳ء میں اسلامیہ کالج پشاور قائم کیا تھا۔ سرحد میں اصلاحات کے نفاذ کے بعد وہ صوبہ کے واحد وزیر مقرر ہوئے۔ سرحد کی دوسری اہم شخصیت عبدالغفار خاں تھے۔ جنہوں نے خدمت خلق کے لئے ۱۹۲۹ء میں سرخ پوش یا خدائی خدمت گار تنظیم قائم کی۔ وہ گاندھی کے فلسفہ عدم تشدد سے بہت متاثر تھے۔ اس لئے ۱۹۳۱ء میں انہوں نے اپنی تنظیم کو کانگرس سے وابستہ کرلیا۔

۱۹۳۷ء میں قائداعظم مسلم لیگ کی تنظیم نو کے سلسلہ میں صوبہ سرحد تشریف لائے۔ اس سے قبل ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں سرخ پوش تنظیم نے کافی سیٹیں حاصل کرلی تھیں۔ اسی دوران سر عبدالقیوم کا انتقال ہو گیا۔ ان حالات میں ڈاکٹر خاں صاحب نے کانگرس سے مل کر وزارت قائم کرلی۔ ۱۹۳۹ء میں کانگرسی وزارتوں نے استعفیٰ دیا تو خاں صاحب کی وزارت بھی مستعفی ہو گئی۔

۱۹۴۰ء میں جب قرارداد پاکستان پیش ہوئی تو سردار اورنگ زیب خان نے صوبہ سرحد کی

نمائندگی کرتے ہوئے پاکستان کے حق میں تقریر کی۔ تاہم ۱۹۴۵ء تک مسلم لیگ اس صوبہ میں پوری طرح منظم نہ تھی۔ کانگرس اور سرخ پوش تنظیم نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان کے خلاف خوب پراپیگنڈہ کیا۔ لیکن ۱۹۴۵ء کے بعد جب مسلم لیگ نے دن بدن مقبولیت حاصل کرنا شروع کی تو کانگرس حکومت نے مسلم لیگ کے کارکنوں پر ظلم و تشدد شروع کر دیا۔ ان پر جھوٹے مقدمے قائم کر کے جیل میں بھیج دیا۔ اس کے باوجود مسلم لیگ کی مہم زور و شور سے جاری رہی۔ ایک خفیہ روزنامہ صدائے پاکستان اور ریڈیو سٹیشن کے ذریعے عوام کی راہنمائی کا کام جاری رکھا گیا۔

فروری ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ اور حکومت سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا۔

اپریل ۱۹۴۷ء میں ماؤنٹ بیٹن نے پشاور کا دورہ کیا حالات کا جائزہ لینے کے بعد اسے احساس ہو گیا کہ عوام مسلم لیگ کے ساتھ ہیں اور خان برادران کا اثر و رسوخ ختم ہو چکا ہے۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کے منصوبے کے اعلان کے ساتھ ہی قائد اعظم نے سرحد میں سول نافرمانی کی تحریک کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

۳ جون کے منصوبے کے تحت سرحد میں ۶ جولائی سے ۱۷ جولائی ۱۹۴۷ء کو ریفرنڈم کرایا گیا۔ تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ سرحد کے عوام پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا بھارت میں۔ خان برادران کو جب ریفرنڈم میں کامیابی کی کوئی امید نظر نہ آئی تو انہوں نے آزاد پختونستان کا شوشہ کھڑا کر دیا۔ بہر حال سرحدی عوام نے پاکستان کے حق میں ۲۸۹٬۲۴۴ ووٹ ڈالے جب کہ مخالفت میں صرف ۲۸۷۴ ووٹ پڑے اس طرح یہ صوبہ پاکستان کا حصہ بن گیا۔

صوبہ سرحد میں علماء اور مشائخ نے بھی تحریک پاکستان کے لئے بیش بہا خدمات سرانجام دیں جن میں پیر مانکی شریف اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسلامیہ کالج اور ایڈورڈ کالج پشاور کے طلباء نے بھی جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور صوبہ سرحد کے شعبہ خواتین نے بھی تحریک آزادی کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔

بلوچستان: بلوچستان برطانوی سلطنت کا ایک نہایت پسماندہ علاقہ تھا۔ اس کی ترقی کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔ جس کی وجہ سے اس صوبہ میں بنیادی سہولتوں کا فقدان رہا۔ ۱۹۲۷ء میں مسلم لیگ نے مطالبہ کیا کہ بلوچستان میں بھی دوسرے صوبوں جیسی سیاسی اصلاحات نافذ کی جائیں۔ لیکن حکومت نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔

جون ۱۹۳۹ء میں بلوچستان میں مسلم لیگ کی صوبائی شاخ قائم ہوئی۔ مسلم لیگ کو فعال بنانے میں قاضی محمد عیسیٰ نے نمایاں حصہ لیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قاضی محمد عیسیٰ نے بلوچستان کی نمائندگی کرتے ہوئے قرارداد پاکستان کی حمایت کی۔ اگلے سال ۲۳ مارچ کو کوئٹہ میں یوم پاکستان منایا گیا اور ایک عظیم الشان جلسہ عام منعقد ہوا جس کے بعد بلوچستان میں آزادی کی جدوجہد تیز ہو گئی۔ بلوچستان کے طلباء نے بھی تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ۱۹۴۳ء میں مسلم

سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی۔ جون ۱۹۴۳ء میں قائد اعظم نے بلوچستان کا تفصیلی دورہ کیا۔ ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں بلوچستان کی دستوریہ کی نشست پر کانگرسی امیدوار اچکزئی کے مقابلے میں مسلم لیگ کی حمایت سے نواب محمد خان جوگیزئی نے کامیابی حاصل کی۔

صوبہ بلوچستان میں صوبائی اسمبلی موجود نہیں تھی۔ اس لئے ۳ جون ۱۹۴۷ء کے منصوبے کے تحت اعلان کیا گیا کہ اس صوبہ میں شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپلٹی کے غیر سرکاری اراکین پاکستان یا ہندوستان میں شمولیت کا فیصلہ کریں گے۔ کانگرس نے اس سلسلہ میں بڑی سازشیں کیں کہ یہ صوبہ بھارت سے الحاق کا فیصلہ کرے۔ مگر جب ماؤنٹ بیٹن کے نمائندہ نے شاہی جرگہ میں اعلان پڑھنا شروع کیا تو نواب محمد خان جوگیزئی نے کھڑے ہو کر کہا کہ ہم نے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔

سندھ: برصغیر میں اسلام سب سے پہلے سندھ کے راستے سے آیا۔ اس لیے اس صوبہ کو باب الاسلام کہا جاتا ہے۔ انگریزوں نے اس مسلم اکثریتی صوبہ کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے اسے بمبئی سے ملا دیا۔ مسلم لیگ کے مطالبہ پر بالآخر اسے ۱۹۳۵ء میں ایک علیحدہ صوبہ بنایا گیا۔

جدوجہد آزادی میں سندھ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مسلم لیگ کا پہلا سالانہ اجلاس ۱۹۰۷ء میں کراچی میں منعقد ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ سندھ شاخ نے مطالبہ کیا کہ برصغیر کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں مسلمانوں کو اپنی حکومت قائم کرنے کی اجازت دی جائے یہی قرارداد آخر کار قرارداد پاکستان کا پیش خیمہ بنی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو سندھ کی طرف سے سر عبداللہ ہارون نے قرارداد پاکستان کی حمایت میں تقریر کی۔

سندھ میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لیے قائد اعظم نے ایک کمیٹی مقرر کی جس نے اس ضمن میں گراں قدر خدمات انجام دیں... جن کے نتیجے کے طور پر ۱۹۴۳ء میں سندھ مسلم لیگ کی وزارت قائم ہوئی جو برصغیر کی پہلی مسلمان وزارت تھی۔ مارچ ۱۹۴۳ء میں سندھ اسمبلی نے مطالبہ پاکستان کے حق میں قرارداد منظور کی۔

۱۹۴۵-۴۶ء کے انتخاب میں مسلم لیگ نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی اور سر غلام حسین ہدایت اللہ کی قیادت میں وزارت بنائی گئی۔ سیاسی جوڑ توڑ اور سازشوں کے نتیجے کے طور پر گورنر نے اسمبلی توڑ کر جب دسمبر ۱۹۴۶ء میں دوبارہ انتخابات کرائے تو مسلم لیگ نے سو فیصد سیٹیں جیت لیں۔ ۳ جون کے منصوبے کے تحت سندھ کی اسمبلی کے ارکان نے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔

سندھ کی جدوجہد آزادی میں پیر پگارا صبغت اللہ شاہ کا سب سے اہم حصہ ہے۔ آپ کے مرید حر کہلاتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران پیر پگارا نے انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کیا۔ جس پر انگریزوں نے بڑی مشکل کے بعد قابو پایا۔ پیر پگاڑا کو شہید کر کے ان کے بیٹوں کو انگلستان بھیج دیا گیا۔

سندھ میں مشائخ کے سرہندی خاندان نے اپنے جد امجد حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تحریک آزادی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس ضمن میں مولانا محمد اسماعیل اور پیر غلام مجدد کے نام قابل ذکر ہیں۔ سندھ کے مشائخ نے پیر عبدالرحمٰن کی قیادت میں جمعیت المشائخ قائم کی جو بعد میں مسلم لیگ میں ضم کردی گئی۔

سندھ مدرستہ الاسلام کے طلباء نے بھی آزادی کے لیے بڑی جدوجہد کی اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو فعال بنایا۔ نوجوانوں میں جی الانہ' پیرزادہ عبدالستار' قاضی فیض اللہ اور یوسف ہارون کے نام قابل ذکر ہیں۔

سندھ کی خواتین نے مردوں کے شانہ بشانہ تحریک آزادی میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ بیگم عبداللہ ہارون آل انڈیا خواتین مسلم لیگ کی صدر تھیں۔ بیگم غلام حسین ہدایت اللہ نے بھی تحریک پاکستان میں اہم رول ادا کیا۔

پنجاب: پنجاب مسلم اکثریت کا صوبہ تھا۔ لیکن مشرقی حصے میں ہندوؤں اور سکھوں کی کافی تعداد آباد تھی۔ مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم بہت زیادہ تعلیم یافتہ اور دولت مند تھے۔ اس لیے مسلمان انگریزوں اور ہندوؤں دونوں کے استحصال کا شکار تھے۔

تحریک پاکستان میں اہل پنجاب کی خدمات کا تذکرہ سنہری حروف میں کیا جائے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کی جتنی قیمت پنجاب نے ادا کی وہ کسی اور صوبہ کے حصہ میں نہیں آئی۔

چوہدری رحمت علی نے پاکستان کا نام تجویز کیا اور پاکستان نیشنل موومنٹ قائم کر کے پاکستان کے تصور کی اشاعت کی۔ نظریہ پاکستان کی اصطلاح بھی سب سے پہلے آپ ہی نے استعمال کی۔

علامہ اقبال نے اپنے افکار اور اشعار کے ذریعے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ آپ نے دو قومی نظریہ کی فکری بنیادوں پر وضاحت کی اور مسلمانوں کو اپنے تشخص کی بحالی کا درس دیا۔ علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں خطبہ الہ آباد میں ایک آزاد مسلم ریاست کا تصور پیش کیا۔

پنجاب کی سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منٹو پارک کے میدان میں قرارداد پاکستان پیش ہوئی۔ جس نے مسلمانوں ہند کو فکر و عمل کی نئی راہیں دکھائیں۔

پنجاب کی طرف سے مولانا ظفر علی خان نے قرارداد کی حمایت کی۔ قرارداد پاکستان کے بعد مسلم لیگ نے پنجاب میں زبردست مہم چلائی۔ تحریک پاکستان میں پنجاب کے علماء اور مشائخ نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں اور مریدوں کو جدوجہد آزادی کے لیے تیار کیا۔ ان میں پیر جماعت علی شاہ' ابوالحسنات قادری' خواجہ قمرالدین سیالوی اور غلام محی الدین شاہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پنجاب میں ۱۹۳۸ء سے یونینسٹ پارٹی برسراقتدار تھی۔ یہ پارٹی مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی راہ میں رکاوٹ ڈالتی رہی۔ ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں اس کو صرف دس نشستیں ملیں مگر

ملک خضر حیات ٹوانہ نے غیر مسلموں کے تعاون سے اپنی وزارت قائم کرلی۔ جس کی وجہ سے مسلمان بہت برہم ہوئے اور انہوں نے خضر حیات وزارت سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا۔ جس سے انکار پر فروری ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگ نے صوبے میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ خضر وزارت نے مسلم لیگ نیشنل گارڈ کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ لیکن تشدد کے باوجود اس تحریک پر قابو نہ پایا جاسکا۔ بالآخر ۲ مارچ کو خضر حیات نے استعفیٰ دے دیا۔

پنجاب کے طلباء کی قیادت کا مرکز اسلامیہ کالج لاہور تھا۔ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے آزاد مسلم ریاست کا مطالبہ اپنے مقاصد میں شامل کیا۔ مارچ ۱۹۴۱ء کو اسلامیہ کالج لاہور میں پاکستان کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت قائداعظم نے فرمائی۔ یونینسٹ وزارت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک کے دوران طلبہ پنجاب کے دیہات میں پھیل گئے۔ اور حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان نوجوانوں میں حمید نظامی' حکیم آفتاب قرشی' سید قاسم رضوی' میاں محمد شفیع اور مولانا عبدالستار نیازی کے نام قابل ذکر ہیں۔

پنجاب کی خواتین بھی آزادی کی تحریک میں کسی سے کم نہ تھیں۔ ایک نوجوان طالبہ فاطمہ صغریٰ نے لاہور کی سول سیکرٹریٹ سے برطانوی جھنڈا اتار کر پہلی بار پاکستان کا پرچم لہرایا۔ پنجاب کی خواتین بیگم سلمیٰ تصدق حسین' بیگم شاہنواز اور بیگم سر محمد شفیع کی خدمات اہم ہیں۔

مسلم اقلیتی صوبے

ہندوستان کے کئی صوبے جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ حصول پاکستان کی جدوجہد میں برابر کے شریک تھے۔ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو علم تھا کہ ان کے علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے۔ اس کے باوجود تحریک پاکستان میں حصہ لے کر انہوں نے ہندوؤں کی دائمی دشمنی مول لی۔

۱۹۴۰ء کی قرارداد کی حمایت چوہدری خلیق الزمان نے کی۔ جو مسلم اقلیتی صوبے یو۔پی کے نمائندے تھے۔ ان کے بعد بہار' مدراس' بمبئی اور سی۔ پی کے نمائندوں نے بھی قرارداد کی حمایت کی۔

46 - 1945ء کے انتخابات مطالبہ پاکستان کی بنیاد پر لڑے گئے۔ بمبئی' مدراس اور اڑیسہ میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کی ساری نشستیں جیت لیں۔ ان واقعات سے مسلم اقلیتی صوبوں سے مسلمانوں کے جذبہ ایثار و قربانی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان صوبوں کے علماء اور مشائخ نے بھی تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ کو کامیاب بنانے میں علماء اور مشائخ نے بہت خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۴۶ء میں بنارس میں مشائخ کانفرنس منعقد ہوئی اور اس میں مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کیا گیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء نے آل انڈیا مسلم لیگ سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھی اور قیام پاکستان میں ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں۔

تقسیم بنگال کے اسباب اور اس پر ہندوؤں کا ردعمل

تقسیم بنگال کی تجویز:

تقسیم بنگال کا سلسلہ کافی عرصے سے چل رہا تھا۔ اس پر حکومت برطانیہ نے "3 سال" تک غور کیا۔ مختلف خودمختار اداروں سے مشورے کئے۔ "1902" میں تقسیم بنگال کی تجاویز کی فائل گورنر جنرل لارڈ کرزن کے سامنے پیش ہوئی تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ خود بھی ان دونوں صوبوں کی از سر نو حد بندی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لہٰذا اب تقسیم بنگال کو انتظامی سہولت کے لئے جلد عملی صورت پہنانی چاہئے۔ تقسیم بنگال کی تجویز مقامی خود اختیاری حکومتوں کے پاس رائے طلب کرنے کے لئے بھیجی گئی ان خودمختار حکومتوں نے اس تجویز کی تائید کی۔

تقسیم بنگال "1905":

تقسیم بنگال بیسوی صدی کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس صوبے کی آبادی بھی بہت زیادہ تھی۔ آبادی کے زیادہ ہونے کے علاوہ رقبہ بھی بہت تھا۔ اس کا نظام چلانا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ اس لئے انتظامی سہولت کے پیش نظر انگریزوں نے بنگال کو "1905" میں دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اور دونوں حصوں کو دو صوبوں کا نام دیا گیا۔ ایک صوبہ مغربی بنگال اور دوسرا صوبہ مشرقی بنگال کے نام سے مشہور ہوا۔ تقسیم ہند کے وقت مشرقی بنگال پاکستان اور مغربی بنگال بھارت میں شامل کر دیا گیا۔ کیونکہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی آبادی بہت زیادہ تھی اور مغربی بنگال میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔

مشرقی بنگال کا صدر مقام ڈھاکہ اور مغربی بنگال کا صدر مقام کلکتہ کو بنایا گیا۔

تقسیم کے اسباب:

تقسیم بنگال کیوں عمل میں آئی اس کے اسباب درج ذیل ہیں۔

1- بنگال کی آبادی اور رقبہ بہت زیادہ تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا انتظام چلانا مشکل ہو گیا تھا۔

2- ذرائع آمد و رفت کا فقدان تھا۔ اس لئے بنگال میں ہنگامی حالات پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔

3- بنگال میں ہندو مسلم فسادات انگریزوں کے لئے سوہان روح بن گئے تھے۔

4- تمام تجارتی اور معاشی امور پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ کارخانے، تجارتی منڈیاں اور کاروبار کی ساری آسانیاں ہندوؤں کو میسر تھیں۔ اس لئے مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی حالت بہت ہی خراب تھی۔

5- بنگال میں معاشرتی برائیوں نے زور پکڑا ہوا تھا۔ ڈاکہ زنی، چوری اور قتل جیسی برائیاں عام ہو چکی تھیں۔ امن و امان ختم ہو چکا تھا۔ گویا ساتھی تحفظ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لئے تقسیم بنگال ضروری ہو گئی تھی۔

6- مشرقی حصے کی تمام پیداوار پر مغربی حصے کے لوگوں کی اجارہ داری تھی۔

7- ہندو زمینداروں نے مسلمانوں پر ظلم و تشدد کیا ہوا تھا اور انہوں نے مسلمانوں کا معیار زندگی پست کر دیا تھا۔

تقسیم بنگال پر ہندوؤں کا ردعمل:

تقسیم بنگال مسلمانوں کے مفاد میں تھی اس لئے ہندو اس تقسیم سے بہت ناراض ہوئے۔ انہوں نے تقسیم بنگال کے خلاف مظاہرے شروع کر دیئے۔ اس سلسلے میں ہندوؤں نے باقاعدہ تحریک چلائی۔ اس تحریک کی کامیابی کیلئے ہندوؤں نے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کئے۔ بنگال کے [illegible] چلانے والوں کو تنگ کیا گیا۔ لارڈ کرزن پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے۔ غیر ملکی مال کا بائیکاٹ کیا گیا۔ انگریزوں پر بم پھینکے گئے۔ اس دن ہندوؤں نے سوگ کا دن منایا۔ اور بھرت رکھا۔ اور "بندے ماترم" کو بطور قومی ترانہ اختیار کیا۔ ان باتوں سے تنگ آ کر لارڈ کرزن نے استعفیٰ دے دیا۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ جب تک حکومت برطانیہ اس تقسیم کو منسوخ نہیں کرتی۔ وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ ان کا یہ سلسلہ 1911ء تک چلتا رہا۔

تقسیم بنگال پر مسلمانوں کا ردعمل:

تقسیم بنگال پر مسلمانوں نے نہ صرف خوشی کا اظہار کیا بلکہ اطمینان کا سانس بھی لیا۔ تقسیم بنگال مسلمانوں کے مفادات میں تھی اس لئے انہوں نے تقسیم کے فیصلے کو قبول کر لیا اور اسے برقرار رکھنے کا مطالبہ کرتے رہے۔ بلکہ اس سے معیار زندگی بلند کرنے کا راستہ ہموار ہو گیا تھا۔ مسلمانوں نے بہت سی قراردادیں منظور کرا کر حکومت برطانیہ کو روانہ کیں۔ اور تقسیم بنگال پر حکومت کا شکریہ ادا کیا۔

شملہ وفد کی تشکیل، مطالبات اور اہمیت یا

''شملہ وفد 1906'' کے مطالبات

شملہ وفد 1906:

برطانیہ میں 1905ء کے انتخابات میں لیبر پارٹی برسراقتدار آگئی۔ اس پارٹی نے انتخابات کے فوراً بعد ہندوستان میں نئی آئینی اصلاحات نافذ کرنا ضروری سمجھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں نے اپنے مطالبات برطانوی حکومت تک پہنچانے کا ارادہ کر لیا۔ اس سلسلے میں نواب محسن الملک نے دوسرے مسلم رہنماؤں سے مشورے کیے اور سب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ ایک مسلم وفد تشکیل دے کر وائسرائے ہند کو مسلمانوں کے موقف سے آگاہ کیا جائے۔ یوں یہی وفد شملہ وفد کہلاتا ہے۔

شملہ وفد کی تشکیل:

شملہ وفد کی تشکیل لکھنؤ میں سر عبدالرحیم کی صدارت میں مسلم قائدین کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں نواب محسن الملک کو اراکین کے چناؤ کا کلی اختیار دے دیا گیا۔ انہوں نے اس وفد کے لئے 35 اراکین کا انتخاب کیا۔ یہی 35 رکنی وفد یکم اکتوبر 1906ء کو شملہ کے مقام پر سر آغا خان کی قیادت میں وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے ملا اور اپنے مطالبات کی دستاویز پیش کی۔

شملہ وفد کے مطالبات:

شملہ وفد نے لارڈ منٹو کو جو دستاویز پیش کی اس میں مندرجہ ذیل مطالبات شامل تھے۔

1- ہندوؤں اور مسلمانوں کے انتخابی حلقے الگ الگ کر کے انہیں جداگانہ انتخاب کا حق دیا جائے۔

2- مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں اور یونیورسٹیوں کے سنڈیکیٹ میں مناسب نمائندگی دی جائے۔

3- مسلمانوں کو مجلس قانون ساز میں مناسب نمائندگی دی جائے۔

4- مسلمانوں کو عدلیہ میں نمائندگی دی جائے۔

5- مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لئے امداد دی جائے۔

شملہ وفد کی اہمیت:

شملہ وفد کے مطالبات کے جواب میں لارڈ منٹو نے مسلمانوں کو پورا پورا یقین دلایا کہ ان کے سیاسی حقوق اور مفادات کا تحفظ کیا جائے گا اور دوسرے مطالبات پر ہمدردانہ غور کیا جائے گا۔ وائسرائے ہند کے اس وعدے کو برطانوی حکومت نے قانون مجریہ 1909ء میں عملی شکل دے دی گئی اور جداگانہ انتخاب کا مطالبہ منظور کر لیا گیا۔

اس طرح برطانیہ نے پہلی مرتبہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کو باضابطہ تسلیم کیا اور اسی اصول نے پاکستان کی بنیاد رکھی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام 1906ء

پس منظر:۔

مسلمان جداگانہ نمائندگی اور نیابت تک کا مطالبہ تو سرسید احمد خان کے دور سے کر رہے تھے اور وہی شملہ وفد کے مطالبات کی اصل روح تھے۔ اس بات میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں کہ سرسید نے مسلمانوں کو باقاعدہ سیاست اور کانگریس سے دور رہنے کی تاکید کی تھی مگر اب حالات نے مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

جب 1905ء میں تقسیم بنگال کے ثمرات سے فائدہ اٹھانے اور نئی آمدہ آئینی اصلاحات میں سے حصہ وصول کرنے کے لئے منظم جدوجہد کی ضرورت تھی تو ہندوؤں نے اردو ہندی جھگڑے اور تقسیم بنگال کے معاملات میں مخالفانہ اور معاندانہ رویہ اختیار کیا اور مسٹر تلک جیسے انتہا پسند مذہبی جنونیوں نے فرقہ وارانہ فضا پیدا کر کے مسلمانوں کے لئے اس تقسیم سے فائدہ اٹھانے کے تمام راستے بند کر دیے۔ نیز تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کا منظم احتجاج کانگریس کے ذریعے ہو رہا تھا مگر اس کی حمایت میں مسلمانوں کی انفرادی آوازیں نمایاں نہیں ہو پاتی تھی۔ چنانچہ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کی بھی اپنی ایک سیاسی جماعت ہونا چاہیے۔

مسلم لیگ کی تشکیل:۔

یکم اکتوبر 1906ء کو مسلمانوں نے وائسرائے ہند لارڈ منٹو کے پاس اپنے مطالبات پیش کرنے کے لئے ایک وفد شملہ بھیجا۔ یہ 35 رکنی وفد سر آغا خان کی قیادت میں شملہ کے مقام پر لارڈ منٹو سے ملا اور اسے اپنے مطالبات کی دستاویز پیش کی۔ لارڈ منٹو نے مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کو تسلیم کر لیا اس سے

مسلمانوں میں جداگانہ وجود کا احساس پیدا ہو گیا مگر انہیں اس امر کا بھی خیال تھا کہ وہ بغیر کسی سیاسی جماعت کے اپنے مفادات کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ وفد کے ارکان ابھی شملہ میں ہی تھے کہ سلیم اللہ خان نواب آف ڈھاکہ جو علالت کے سبب وفد میں شرکت نہ کر سکے تھے نے ارکان وفد کو ایک سیاسی تنظیم بنانے کی طرف توجہ دلائی۔ اس پر قوم کے زعماء اور عمائدین نے طے کیا کہ دسمبر 1906 میں "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کے ڈھاکہ میں منعقد ہونے والے اجلاس میں اس امر پر غور کیا جائے۔ چنانچہ کانفرنس کے بعد 30 دسمبر کو ایک اجلاس نواب وقار الملک کی صدارت میں منعقد ہوا اور پورے غور و خوض کے بعد "آل انڈیا مسلم لیگ" کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ چنانچہ نواب وقار الملک کی صدارتی تقریر کے بعد نواب سلیم اللہ نے باقاعدہ ایک قرارداد پیش کی جس میں مسلمانوں کی سیاسی جماعت کے قیام پر زور دیا گیا تھا۔ قرارداد منظور کر لی گئی اور مسلمانوں کی سیاسی جماعت وجود میں آ گئی۔ اس قرارداد کی تائید حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان نے کی۔

مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد:۔

ڈھاکہ اجلاس میں مسلم لیگ کے مندرجہ ذیل تین مقاصد طے پائے۔

1- مسلمانوں میں حکومت برطانیہ کے لئے وفاداری کے جذبات پیدا کرنا اور حکومت کی غلط فہمیوں کو دور کرنا۔

2- مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا اور ضروریات کو حکومت کے سامنے پیش کرنا۔

3- جہاں تک مسلمانوں کو نقصان نہ ہو دوسری قوموں سے اتحاد کرنا۔

گویا مسلم زعماء اس تنظیم کو دوسری قوموں کے خلاف اور جھگڑے کا ذریعہ نہیں بلکہ باہمی تعاون کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے اور دوسرے وہ پُرامن جدوجہد پر یقین رکھتے تھے اور ہندوؤں کی طرح ہنگامہ خیز سیاست کے قائل نہ تھے۔ وہ ہندوستان کی تمام قوموں کے خیر خواہ تھے اور سب کو خوش دیکھنا چاہتے تھے۔

مسلم لیگ کے اجلاس کی کارروائی مولانا محمد علی جوہر نے تحریر کی۔ اس کے جائنٹ سیکریٹری نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک بنائے گئے اور اس کا صدر دفتر مراد آباد (ضلع امروہہ) میں قائم کیا گیا۔ مسلم لیگ کا پہلا باقاعدہ اجلاس 29'30 دسمبر 1907ء کو کراچی میں منعقد ہوا جس میں لیگ کے دستور کی منظوری دی گئی۔ بعد ازیں مارچ 1908ء میں اس کا ایک خصوصی اجلاس علی گڑھ میں ہوا۔ جس میں نئے عہدیداروں کے انتخاب کا عمل مکمل کیا گیا۔ اس اجلاس میں میجر سید حسین بلگرامی سیکریٹری اور سر آغا خان صدر منتخب ہوئے اور اس کا صدر دفتر بھی مراد آباد کے بجائے علی گڑھ میں طے پایا۔ اسی سال مسلم لیگ کی ایک شاخ لندن میں بھی قائم کر دی گئی جس کی نگرانی سید امیر علی کے سپرد ہوئی۔ اس کے علاوہ ملک بھر میں اس کی شاخیں کھولنے کا بھی اہتمام کیا گیا۔

میثاق لکھنؤ

معاہدہ لکھنؤ برصغیر کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ایک آئینی سمجھوتہ ہوا۔ میثاق لکھنؤ کسی اچانک حادثہ کی پیداوار نہیں تھا بلکہ تعاون اور اتحاد کے اس جذبے کا نتیجہ تھا جو بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان پیدا ہوا۔

پس منظر

۱۔ پرجوش قیادت کا ابھرنا: مسلم لیگ کے قیام کے کچھ عرصہ بعد تک مسلم سیاست پر علی گڑھ مکتب فکر کے لیڈروں کا غلبہ رہا۔ جو اعتدال پسندی اور حکومت کے ساتھ خوشگوار تعلقات کے قائل تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ مسلم قیادت بوڑھے اعتدال پسندوں کی بجائے پرجوش جوانوں میں منتقل ہو گئی جو اپنے حقوق کے لئے انگریزوں کے سامنے دست سوال دراز کرنے کو قومی وقار کے منافی سمجھتے تھے اور مطالبات کے حصول کے لئے حکومت سے کسی تعاون کے قائل نہیں تھے۔

۲۔ مسلم لیگ کے مرکزی دفتر کا لکھنؤ منتقل ہونا: انہی ایام میں مسلم لیگ کا مرکزی دفتر علی گڑھ سے لکھنؤ منتقل کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے اس جماعت پر علی گڑھ کے محتاط اور نرم مزاج لیڈروں کا اثر و رسوخ کم ہو گیا۔

۳۔ مسلمانوں کے اضطراب میں اضافہ: ۱۹۱۱ء کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے جن سے مسلمانوں کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہوا۔ اور وہ حکومت سے بدظن ہو گئے۔ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ سے مسلمانوں کو حکومت سے سخت مایوسی ہوئی اس کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ مسجد کانپور کے حادثہ میں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے گئے۔ طرابلس اور بلقان میں مسلمانوں کی خون ریزی سے ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے۔ ان واقعات کی وجہ سے حکومت پر مسلمانوں کا اعتماد اٹھ گیا اور اس سے نفرت پیدا ہو گئی۔

۴۔ مسلم لیگ کے مقاصد میں تبدیلی: ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں تاج برطانیہ کے زیر سایہ ہندوستان کے لئے موزوں حکومت خود اختیاری کا حصول اس جماعت کا مقصد قرار پایا۔ اس تبدیلی کی وجہ سے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان تعاون کے امکانات بڑھ گئے۔

۵۔ جداگانہ انتخاب کے حق کا حصول: ۱۹۰۹ء کی آئینی اصلاحات میں حکومت نے

مسلمانوں کے لئے جداگانہ طرز انتخاب کے حصول کو تسلیم کر لیا جس کو مسلمان اپنے مفادات اور حقوق کے تحفظ کے لئے بنیادی اہمیت دیتے تھے اس حق کے مل جانے کے بعد مسلم لیگ کے لئے کانگریس کے ساتھ باہمی متفقہ امور پر تعاون آسان ہو گیا۔

۶۔ قائداعظم کی مسلم لیگ میں شمولیت: ۱۹۱۳ء میں قائداعظم مسلم لیگ کے ممبر بن گئے۔ دوسرے پرجوش مسلمان لیڈروں کی طرح آپ بھی ہندو مسلم اتحاد و تعاون کے زبردست حامی تھے۔ چنانچہ میثاق لکھنؤ کے طے پانے میں آپ کی کوششیں سب سے نمایاں ہیں۔

ہندو مسلم مفاہمت کی کوششیں: مندرجہ بالا واقعات نے ملک کی سیاست میں ایسی فضا پیدا کر دی۔ جس میں ہندو مسلم تعاون کی راہ ہموار ہو گئی۔ پہلی جنگ عظیم میں پاک و ہند کے لیڈروں اور افواج نے حکومت سے تعاون کیا تھا۔ اس کے عوض یہ توقع تھی کہ جنگ کے بعد برصغیر کو کسی نہ کسی شکل میں حکومت خود اختیاری دی جائے گی۔

ان حالات میں ہندو اور مسلم قیادت میں یہ احساس بڑھتا گیا کہ اگر وہ جنگ کے خاتمے پر حکومت سے زیادہ مراعات لینا چاہتے ہیں تو انہیں مل کر اپنے مطالبات پیش کرنے چاہئیں۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ دونوں جماعتوں کے سالانہ اجلاس ایک ہی شہر میں بیک وقت ہوں تاکہ باہمی گفت و شنید کا کام آسان ہو سکے۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں دونوں جماعتوں کے اجلاس بمبئی کے مقام پر ہوئے جن میں باہمی تعاون و مفاہمت کی ضرورت پر زور دیا گیا اور ایک آئینی سمجھوتے پر غور کرنے کے لئے الگ الگ کمیٹیاں مقرر کی گئیں۔ ان کمیٹیوں نے مل کر ایک سکیم تیار کی۔ اسے دسمبر ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کے مقام پر دونوں جماعتوں نے اپنے سالانہ جلسوں میں منظور کر لیا۔ اس مشترکہ فارمولے کو میثاق لکھنؤ کہا جاتا ہے۔

میثاق لکھنؤ کی اہم شقیں حسب ذیل تھیں۔

۱۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی تعداد ۱/۳ ہو گی۔
۲۔ مسلمان اپنے نمائندے جداگانہ انتخاب کے ذریعے منتخب کریں گے۔
۳۔ مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہندوؤں کو اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو ان کی آبادی سے زائد نمائندگی دی جائے گی۔
۴۔ صوبائی کونسلوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب حسب ذیل ہو گا۔
پنجاب ۵۰%، بنگال ۴۰%، یوپی ۳۰%، مدراس ۱۵%، سی پی ۱۵%
۵۔ اگر کسی مجلس قانون ساز میں کوئی غیر سرکاری ممبر ایسا مسودہ قانون پیش کرے جسے کسی فرقے کے تین چوتھائی ارکان اپنے لئے نقصان دہ قرار دیں تو اس مسودہ قانون پر بحث نہیں کی جائے گی۔

اہمیت

کانگریس اور مسلم لیگ میں پہلا اور آخری سمجھوتہ: میثاق لکھنؤ کو ہندوستان کی آئینی جدوجہد میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان یہ پہلا اور آخری سمجھوتہ تھا۔ اس کے بعد وہ کسی مسئلے پر متفق نہ ہو سکے اور ان کے درمیان اختلاف رفتہ رفتہ بڑھتا چلا گیا۔

قائداعظم کی شخصیت کا ابھرنا: کانگریس اور مسلم لیگ کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور ان کے درمیان افہام و تفہیم کرانے میں قائداعظم کی ذاتی کوششوں کو بہت دخل تھا۔ اس لئے آپ کو ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کا خطاب دیا گیا۔

مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ: میثاق لکھنؤ مسلمانوں کے نقطہ نظر سے ایک بہت بڑی کامیابی تھی کیونکہ اس میں کانگریس نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ طرز انتخاب کا حق مان لیا۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کو مرکزی اسمبلی میں ایک تہائی نمائندگی مل گئی جبکہ ان کی آبادی ایک چوتھائی تھی۔ لیکن مسلمانوں کو یہ رعایتیں پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کو قربان کرنے کے بعد ملیں جس کی وجہ سے ان صوبوں میں ایسی جماعتیں برسراقتدار رہیں جنہیں غیر مسلموں کی حمایت حاصل تھی یا جن میں غیر مسلم شامل تھے۔

اقلیتی صوبوں میں چند زائد سیٹیں ملنے سے مسلمانوں کو خاص فرق نہ پڑا لیکن اس طرح وہ اکثریتی صوبوں میں بھی اپنی اکثریت کھو بیٹھے۔ اسی لئے علامہ اقبال نے میثاق لکھنؤ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: "ہندو ڈنڈی مار گیا"

مسلمانوں اور مسلم لیگ کا الگ تشخص: اس معاہدہ کے نتیجے میں کانگریس نے بالواسطہ طور پر نہ صرف مسلمانوں کے علیحدہ سیاسی وجود کو تسلیم کر لیا بلکہ مسلم لیگ کو ان کی نمائندہ جماعت بھی مان لیا۔ کانگریسی لیڈروں کو اب یہ احساس ہو گیا کہ وہ مسلمانوں کو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتے اور یہ کہ کانگریس ہندوستان کے تمام باشندوں کی واحد نمائندہ جماعت نہیں ہے۔

۱۹۱۹ء کی اصلاحات پر اثرات: معاہدہ لکھنؤ ملک کی دو سب سے اہم پارٹیوں کے درمیان آئینی معاملات پر ایک سمجھوتہ تھا اس لئے حکومت اسے بالکل ہی نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات میں مسلمانوں کی نمائندگی کے بارے میں اس کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں۔

مسلمان نمائندوں کی اہمیت: اس معاہدہ کی رو سے ہر صوبائی کونسل میں مسلمان نمائندوں کی تعداد اتنی ہو گئی کہ اگر وہ کانگریس کے ساتھ مل جاتے تو حکومت کو شکست ہو جاتی اور اگر وہ حکومت کے ساتھ مل جاتے تو کانگریس کو شکست ہو جاتی اس

کی وجہ سے اس کی اہمیت میں بہت اضافہ ہوا۔

ناپائیدار سمجھوتہ: میثاق لکھنؤ نے مسلمانوں اور ہندوؤں میں تعاون کا جذبہ پیدا کر دیا جس کی بدولت دونوں نے آئندہ دس سالوں میں انگریزوں کے خلاف زوردار تحریکیں چلائیں۔ لیکن ہندو مسلم اتحاد کی یہ فضا ایک طویل عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ اس دور کے بعض واقعات کی وجہ سے ہندو مسلم اختلافات وقتی طور پر دب گئے مگر جونہی حالات تبدیل ہوئے اتحاد کی یہ عمارت زمین بوس ہو گئی۔ اور ہندوؤں نے ۱۹۲۷ء میں نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کے تمام مطالبات جنہیں اس معاہدہ میں تسلیم کیا تھا یکسر مسترد کر دیا۔

تحریک خلافت

بیسویں صدی کے آغاز میں عثمانی ترکوں کی حکومت کمزور ہو چکی تھی۔ مزید برآں ہندوستان کبھی عثمانی خلیفہ کے ماتحت نہیں رہا۔ لیکن اس کے باوجود برصغیر کے مسلمانوں کو ترکی خلافت سے ایک جذباتی تعلق تھا کیونکہ وہ خلیفہ کو اتحاد اسلامی کا مظہر سمجھتے تھے۔

پہلی جنگ عظیم میں بعض وجوہات کی بنا پر جب ترکی نے برطانیہ کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا تو برصغیر کے مسلمانوں کو خدشہ لاحق ہوا کہ جنگ میں شکست کی صورت میں انگریز ترکی سے اچھا سلوک نہیں کریں گے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہمدردیاں ترکی کے ساتھ تھیں اور حکومت برطانیہ مسلمانوں کے دلی جذبات سے واقف تھی۔ اس لئے جنگ کے دوران مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج نے یقین دلایا کہ برطانیہ ترکی کی سلطنت پر قبضہ نہیں کریگا۔ لیکن جنگ کے اختتام پر اتحادیوں نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے اپنی فوجیں بصرہ اور جدہ میں داخل کر دیں اور یونان نے سمرنا پر قبضہ کر لیا۔

خلافت کمیٹی کا قیام: ان واقعات نے برصغیر کے مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت و حقارت کا طوفان پیدا کر دیا۔ لہٰذا ۱۹۱۹ء میں آل انڈیا خلافت کمیٹی قائم کی گئی جس کے مطالبات مندرجہ ذیل تھے۔

(ا) سلطنت ترکی کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کیا جائے۔
(ب) مقامات مقدسہ ترکی کی تحویل میں رہیں۔
(ج) عثمانی خلافت کو برقرار رکھا جائے۔

خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی کے مقام پر ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ مسلمان جنگ عظیم میں انگریزوں کی کامیابی پر منعقد ہونے والے جشن فتح میں شرکت نہیں کریں گے اور اگر ان کے مطالبات منظور نہ ہوئے تو وہ حکومت سے ترک موالات کر لیں گے۔

ہندو مسلم اتحاد: خلافت کمیٹی کے پہلے اجلاس میں ہندوؤں سے بھی تعاون کی اپیل کی گئی۔

جلیانوالہ باغ کے حادثہ کی وجہ سے ملک کی سیاسی فضا پہلے ہی مکدر تھی اور کانگرس نے رولٹ ایکٹ کے خلاف ملک گیر مہم شروع کی ہوئی تھی۔ ان حالات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں حکومت کے خلاف ایک دوسرے سے تعاون کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ گاندھی نے تحریک خلافت اور کانگرس کی سیاسی مہم کو یہ کہہ کر ملا دیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کا ایسا موقع آئندہ سو سال میں بھی دوبارہ نہیں آئے گا۔

وفد خلافت: ۱۹۱۹ء کے آخر میں مسلم لیگ، کانگرس اور خلافت کمیٹی کے اجلاس بیک وقت امرتسر میں ہوئے۔ اسی دوران علی برادران بھی رہائی پاکر سیدھے امرتسر پہنچے۔ خلافت کمیٹی کے اجلاس میں ایک وفد انگلستان بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ وہ حکومت برطانیہ کو مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کر سکے۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں اس وفد نے انگلستان، اٹلی اور فرانس کا دورہ کیا مگر اس کی کہیں بھی شنوائی نہ ہوئی۔ بلکہ برطانوی وزیر اعظم سے ملاقات کے دوران جب وفد نے ترکی سے انصاف کا مطالبہ کیا تو اس نے جواب دیا:

"آسٹریا سے انصاف ہو چکا۔ جرمنی سے انصاف ہو چکا خاصا خوفناک انصاف ------ تو پھر ترکی اس سے کیوں بچے۔"

معاہدہ سیورے: ابھی وفد خلافت انگلستان میں ہی تھا کہ ترکی پر عہد نامہ سیورے مسلط کر دیا گیا۔ جس کی رو سے تمام بیرونی مقبوضات ترکی سے چھین لئے گئے اور اسے بحری اور فضائی فوج رکھنے پر پابندی لگا دی گئی۔ درہ دانیال پر اتحادیوں کی بالادستی قائم رکھی گئی۔

غرضیکہ اتحادیوں نے ترکی کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز سلوک کیا۔ اس ذلیل اور متعصبانہ صلح نامے کے خلاف تمام دنیا کے مسلمانوں نے نفرت اور غصے کا اظہار کیا۔

تحریک ترک موالات: وفد خلافت کی ناکامی اور معاہدہ سیورے کی تفصیلات کی اطلاع جونہی ہندوستان پہنچی، مسلمانوں کا جوش اور اضطراب بڑھ گیا اور مئی ۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی نے ترک موالات کے پروگرام پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا جس کے اہم پہلو مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ حکومت کے عطا کردہ خطابات واپس کر دیے جائیں۔
۲۔ کونسلوں کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا جائے۔
۳۔ سرکاری تقریبات کا مقاطعہ کیا جائے۔
۴۔ سرکاری ملازمتوں سے علیحدگی اختیار کی جائے۔
۵۔ تعلیمی ادارے سرکاری امداد لینا بند کر دیں۔ بصورت دیگر طلبا ایسے ادارے چھوڑ دیں۔
۶۔ مقدمات سرکاری عدالتوں کی بجائے ثالثی عدالتوں میں پیش کئے جائیں۔
۷۔ برطانوی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔

تحریک ترک موالات یا تحریک عدم تعاون پر عمل کرنے کے لئے تشدد کی سختی سے ممانعت کی گئی اور گاندھی کو اس تحریک کا قائد مقرر کیا گیا۔

انگلستان سے واپسی پر مولانا محمد علی جوہر نے گاندھی کے ساتھ مل کر سارے ملک کا دورہ کیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر ترک موالات پر ہر جگہ عمل ہونے لگا۔ ہزاروں کی تعداد میں سیاسی کارکن جیل چلے گئے۔ عدالتوں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ ہر گھر میں چرخہ کاتا جانے لگا۔ اور کھدر سیاسی کارکنوں کا لباس بن گیا۔ ڈیوک آف کناٹ کا دورہ ہندوستان ناکام رہا اور پرنس آف ویلز کی آمد پر ملک میں خونریز فسادات ہوئے۔

جامعہ ملیہ کا قیام: مولانا محمد علی جوہر نے ترک موالات کے پروگرام کے تحت علی گڑھ کالج کی انتظامیہ سے سرکاری امداد نہ لینے کی اپیل کی۔ لیکن جب انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو آپ نے کالج کے بہت سے طلباء کو ساتھ ملا کر علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۲۵ء میں یہ ادارہ دہلی منتقل ہو گیا۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ ہندوؤں نے بنارس کی ہندو یونیورسٹی کو اس تحریک سے بالکل الگ رکھا۔

تحریک ہجرت: تحریک کے دوران کچھ علماء نے برصغیر کو دارالحرب قرار دے کر یہاں سے ہجرت کرنے کا فتویٰ دیا۔ جس پر ہزاروں لوگوں نے اپنا گھربار چھوڑ کر افغانستان کا رخ کیا۔ لیکن وہاں کی حکومت نے آخرکار اپنی سرحدیں بند کر دیں اور مہاجرین کو مجبوراً واپس لوٹنا پڑا۔ ہجرت کے غیر دانشمندانہ فیصلہ کی وجہ سے ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں اور مسلمانوں کی جائیدادیں ہندوؤں کے قبضے میں چلی گئیں۔

مقدمہ بغاوت: ۸ جولائی ۱۹۲۱ء کو خلافت کانفرنس کا ایک اجلاس مولانا محمد علی جوہر کی صدارت میں کراچی میں منعقد ہوا جس میں ایک قرارداد منظور کی گئی کہ مسلمانوں کے لئے فوج اور پولیس کی ملازمت حرام ہے۔ اس پر حکومت نے مولانا محمد علی جوہر اور دوسرے لیڈروں پر مقدمہ بغاوت چلا کر انہیں دو سال قید بامشقت کی سزا دی۔

موپلہ بغاوت: ساحل مالابار پر آباد موپلہ مسلمانوں پر تحریک خلافت کے دوران اس قدر تشدد کیا گیا کہ انہوں نے تنگ آکر اگست ۱۹۲۱ء میں بغاوت کر دی۔ حکومت نے بغاوت کو کچلنے میں بڑی سختی سے کام لیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر ہزاروں موپلے مارے گئے۔ موپلہ بغاوت کے دوران ہندو زمینداروں نے حکومت کا ساتھ دیا۔ جس کی وجہ سے موپلوں نے کچھ ہندوؤں کو قتل کر دیا۔ اور اس طرح ہندو مسلم تعلقات کشیدہ ہو گئے۔

تحریک کا خاتمہ: تمام مسلمان قائدین کے جیل چلے جانے کی وجہ سے تحریک کی قیادت گاندھی کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ۵ فروری ۱۹۲۲ء کو ایک مشتعل ہجوم نے یو۔پی کے ایک گاؤں چوراچوری میں ایک تھانے کو آگ لگا دی۔ جس کی وجہ سے ۲۲ سپاہی جل مرے۔ اس پر گاندھی نے اعلان کر دیا کہ چونکہ یہ تحریک عدم تشدد پر کاربند نہیں رہی۔ اس لئے اسے ختم کیا جاتا ہے۔

گاندھی کے اس فیصلہ سے تحریک خلافت کو بہت نقصان پہنچا۔ کیونکہ تحریک عدم تعاون اور تحریک خلافت ایک ہی تحریک کے دو رخ سمجھے جاتے تھے گاندھی کی اس قلابازی کے باوجود مسلمان اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ لیکن مارچ ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی میں خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا جس کی وجہ سے ہندوستان میں تحریک خلافت بے مقصد ہو کر رہ گئی۔

تحریک خلافت کے نتائج و اثرات

تحریک خلافت جیسی ملک گیر عوامی تحریک کی مثال برصغیر کی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔ اگرچہ یہ تحریک اپنے مقاصد میں ناکام رہی لیکن اس نے ملکی سیاست اور مسلمانوں پر گہرے نقوش مرتب کئے۔

۱۔ سیاسی شعور کی بیداری: تحریک خلافت کی بدولت مسلمانوں میں بے پناہ خود اعتمادی اور سیاسی شعور پیدا ہوا۔ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں دیر سے میدان سیاست میں داخل ہوئے لیکن اپنی جرات اور حریت پسندی کی وجہ سے ہندوؤں سے آگے نکل گئے۔ مسلمانوں نے اس تحریک میں سیاسی احتجاج کا طریقہ سیکھا اور بے مثال جانی اور مالی قربانیاں پیش کیں۔

۲۔ پرجوش قیادت کا ابھرنا: تحریک خلافت نے ایسے لیڈر پیدا کئے جن کا عوام سے براہ راست رابطہ تھا۔ ان لیڈروں کا جذبہ قربانی و خلوص ہماری قومی روایات کا روشن پہلو ہے۔ یہ لیڈر پس پردہ کام کرنے کی بجائے عوام کے دوش بدوش سرگرم عمل رہے اور ان میں اپنے مطالبات منوانے کے لئے حکومت سے درخواست کرنے کی بجائے اس سے ٹکر لینے کی صلاحیت موجود تھی۔ تحریک خلافت نے بے شمار سیاسی کارکن تیار کیے۔ جنہوں نے تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا۔

۳۔ ہندو مسلم اتحاد کا خاتمہ: تحریک خلافت کے دوران ہندو مسلم اتحاد اپنے نقطہ عروج پر تھا۔ لیکن گاندھی کی قلابازی سے یہ اتحاد پارہ پارہ ہو گیا اور جلد ہی بڑی شدت سے ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ اس تحریک کے بعد ہندو اور مسلمان کبھی کسی معاملے پر متفق نہ ہو سکے اور ان کے درمیان اختلافات کی خلیج بڑھتی گئی۔

۴۔ علماء اور طلبا کا سیاست میں داخلہ: تحریک خلافت کے دوران علماء اور طلباء نے براہ راست سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا اور علماء کی سرگرمیاں صرف مسجدوں تک ہی محدود نہ رہیں۔ مسلم طلباء نے بھی تعلیمی اداروں کو چھوڑ کر عملی سیاست میں قدم رکھا اور یہ روایت تحریک پاکستان کے دوران بھی قائم رہی۔

۵۔ گاندھی کی قیادت: گاندھی اس ملک کی سیاست میں بالکل نووارد تھا۔ لیکن اس تحریک کی بدولت اس نے بہت شہرت اور اہمیت حاصل کر لی۔ کانگرس کا

کوئی لیڈر اب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہندوؤں کا مہاتما بن گیا اور ساری زندگی ہندو سیاست پر چھایا رہا۔

۶۔ **مسلمانوں کی مایوسی:** تحریک خلافت کی ناکامی سے مسلمانوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ خلافت کے تحفظ کے لئے انہوں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر قربانیاں دیں۔ جس کی وجہ سے ان کی معاشی اور تعلیمی ترقی پر برا اثر پڑا۔

۷۔ **ترکی کی بالواسطہ امداد:** تحریک خلافت ترکی سلطنت اور عثمانی خلافت کو بچانے میں ناکام ہوئی۔ لیکن اس کے بے پناہ جوش و جذبہ کو دیکھ کر برطانیہ یونان کی امداد نہ کر سکا اور اس طرح مصطفیٰ کمال پاشا کے لئے یونان کو شکست دے کر ترکی کو آزاد کرانا ممکن ہو گیا۔

۸۔ **داخلی مسائل کی طرف توجہ:** تحریک خلافت کے دوران برصغیر کے عوام اور لیڈروں کی ساری توجہ ایک بیرونی مسئلہ پر مرکوز رہی۔ تحریک کی ناکامی کے بعد ملکی معاملات لیڈروں کی توجہ کا مرکز بن گئے اور آئینی اصلاحات کے حصول کے لئے جدوجہد میں اضافہ ہوا۔

۹۔ **کانگرس اور جمعیت علمائے ہند میں تعاون:** کانگرس اور جمعیت علمائے ہند میں تعاون تحریک خلافت کے دوران پیدا ہوا اور پاکستان بننے تک یہ جماعت کانگرس کی ہمنوا رہی۔ علماء اپنی سادگی کے باعث آئینی مسائل اور ہندو کی عیارانہ سیاست کو نہ سمجھ سکے اور مسلسل کانگرسی نقطہ نظر کی حمایت کرتے رہے۔

تجاویز دہلی

ہندوؤں نے اگرچہ میثاق لکھنؤ میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا تھا لیکن ان میں سے اکثر اسے ملکی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کے راستے میں رکاوٹ سمجھتے تھے چنانچہ ۱۹۲۷ء میں مرکزی اسمبلی کے بجٹ اجلاس کے دوران ایک نجی ملاقات میں موتی لال نہرو نے قائداعظم سے کہا کہ اگر مسلمان جداگانہ انتخابات سے دستبردار ہو جائیں تو کانگرس ان کے باقی مطالبات تسلیم کرے گی۔ قائداعظم کا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ ہندوستان کے لئے خود اختیاری کا حصول ہندو مسلم اتحاد کے بغیر بہت مشکل ہو گا اور یہ کہ سات کروڑ مسلمانوں کو نظرانداز کر کے کوئی جمہوری نظام ہندوستان میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے اگر کانگرس مسلمانوں کے دیگر مطالبات مان لے جو ان کے مفادات کے تحفظ کے لئے ضروری ہیں تو جداگانہ انتخابات کے اصول کو ترک کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

چنانچہ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں قائداعظم نے مسلمان قائدین کی ایک کانفرنس بلائی جس میں کافی غور و فکر کے بعد مندرجہ ذیل فارمولا تیار کیا گیا اسے تجاویز دہلی کا نام دیا گیا۔

۱۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک الگ صوبہ بنایا جائے گا۔
۲۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھی دیگر صوبوں جیسی اصلاحات نافذ کی جائیں۔
۳۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے کم از کم ۱/۳ نشستیں مخصوص کی جائیں۔
۴۔ مسلمان سندھ، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں وہی مراعات ہندوؤں کو دیں گے جو مسلم اقلیت کے صوبوں میں ہندو مسلمانوں کو دیں گے۔
۵۔ پنجاب اور بنگال کی قانون ساز مجالس میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب سے مقرر کی جائے۔

یہ بات واضح کر دی گئی کہ اس پیشکش کو کلی طور پر قبول یا مسترد کیا جائے۔ مندرجہ بالا تجاویز منظور ہو جانے کی صورت میں مسلمان مخلوط انتخابات پر رضامند ہو جائیں گے۔

تجاویز دہلی کے پیچھے ہندوستان میں اتحاد و تعاون کی فضا قائم کرنے کا جذبہ کار فرما تھا بعض ہندو لیڈروں نے وقتی طور پر ان تجاویز کا خیر مقدم کیا لیکن متعصب ہندوؤں نے ان تجاویز کی مخالفت کی اور کہا کہ مسلمانوں کو مخلوط انتخابات غیر مشروط طور پر تسلیم کرنے چاہئیں۔ چنانچہ اگلے سال ہی نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کے ان تمام مطالبات کو رد کر دیا گیا۔ اس طرح دونوں قوموں میں مفاہمت کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ تجاویز دہلی کی وجہ سے مسلم لیگ اختلافات کا شکار ہو گئی۔ سر محمد شفیع نے جداگانہ انتخابات کے مطالبے سے کسی صورت میں بھی دستبردار ہونے سے انکار کر دیا۔ اس طرح وقتی طور پر مسلم لیگ دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروپ شفیع لیگ کہلایا اور دوسرا جناح لیگ۔

نہرو رپورٹ

برطانوی حکومت نے ۱۹۱۹ء کی اصلاحات نافذ کرتے وقت اعلان کیا تھا کہ دس سال بعد ایک کمشن مقرر کیا جائے گا۔ جو ان کی کارکردگی کا جائزہ لے کر مزید آئینی اصلاحات کے بارے میں سفارشات پیش کرے گا۔ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں نے بھی اسی دوران نئی اصلاحات کا مطالبہ شروع کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں سات ممبروں پر مشتمل سر جان سائمن کی قیادت میں ایک کمشن کے قیام کا اعلان کیا گیا جس میں کوئی ہندوستانی شامل نہ تھا۔ برصغیر کے سیاست دانوں نے اس کو اپنی توہین سمجھا اور اس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔

وزیر ہند نے تمام انگریز ارکان کے تقرر کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ کشیدگی ابدی نوعیت کی ہے اور برصغیر کے لیڈر اپنے ملک کے لئے ایک متفقہ دستور نہیں

بنا سکتے۔

وزیر ہند کے اس بیان کو برصغیر کے لیڈروں نے چیلنج سمجھا اور ایک متفقہ آئینی فارمولا تیار کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ چنانچہ فروری ۱۹۲۸ء میں دہلی کے مقام پر آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی۔ لیکن ایک ماہ کے غور و فکر کے بعد یہ اجلاس بغیر کسی فیصلہ کے برخاست ہو گیا۔ مگر اس میں یہ بات واضح ہو گئی کہ ہندو لیڈر مسلمانوں کے مطالبات ماننے کے لئے تیار نہیں۔

مئی ۱۹۲۸ء میں بمبئی میں آل پارٹیز کانفرنس کا دوبارہ اجلاس شروع ہوا اور موتی لال نہرو کی قیادت میں دستوری خاکہ تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ جس میں سر علی امام اور محمد شعیب قریشی مسلمانوں کے نمائندے تھے۔ سر علی امام صرف ایک اجلاس میں شریک ہوئے اور بعد میں رپورٹ پر دستخط کر دیئے جب کہ شعیب قریشی نے کمیٹی کے فیصلوں سے اختلاف کیا۔

کمیٹی کی تجاویز کو نہرو رپورٹ کہا جاتا ہے اور اس کی اہم سفارشات مندرجہ ذیل تھیں۔

۱۔ نہرو رپورٹ میں ہندوستان کیلئے مکمل آزادی کی بجائے نوآبادیات کا درجہ تجویز کیا گیا۔
۲۔ برصغیر کے لئے وحدانی طرز حکومت تجویز کیا گیا جس میں مرکز کو بہت زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ باقی ماندہ اختیارات بھی مرکز کے سپرد کئے گئے۔
۳۔ رپورٹ میں مسلمانوں کے مطالبات کو کوئی اہمیت نہ دی گئی اور ان کے خدشات کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ ملک میں ان کی تعداد کافی ہے اور وہ اپنے مفادات کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اس لئے انہیں خصوصی تحفظات کی ضرورت نہیں۔
۴۔ جداگانہ طرز انتخابات کے اصول کو جذبہ قومیت کے لئے مضر سمجھ کر مسترد کر دیا گیا اور کہا گیا کہ اس سے اکثریت اور اقلیت کے تعلقات ہمیشہ خراب رہیں گے۔
۵۔ مختلف قوموں کے لئے نشستیں مخصوص کرنے کی اس وجہ سے مخالفت کی گئی کہ یہ بات فرقہ وارانہ جذبات کو شہ دے گی۔ چنانچہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے نمائندگی دینے سے انکار کر دیا گیا۔
۶۔ ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے مطابق سیٹیں دینے کی سفارش کی گئی اور زائد نمائندگی کی رعایت کو ختم کرنے کے لئے کہا گیا۔
۷۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی ایک تہائی کی بجائے ۱/۴ سیٹیں دینے کی سفارش کی گئی۔
۸۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے علیحدہ صوبہ بنانے کے لئے کہا گیا بشرطیکہ سندھ مالی لحاظ سے خود کفیل ہو۔
۹۔ صوبہ سرحد میں دوسرے صوبوں کی طرح آئینی اصلاحات نافذ کرنے کے لئے کہا گیا مگر بلوچستان کا کوئی ذکر نہ کیا گیا۔ جب کمیٹی کی توجہ اس طرف دلائی گئی تو اس نے کہا کہ ایسا غلطی سے ہوا ہے۔

نہرو کمیٹی کی ان سفارشات کو بل کی شکل میں تمام سیاسی پارٹیوں کے کنونشن میں پیش کیا گیا۔ قائداعظم نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مصالحت کرانے کی پوری کوشش کی اور مندرجہ ذیل ترامیم اس شرط کے ساتھ پیش کیں کہ ان کو مان لینے کی صورت میں مسلم لیگ نہرو رپورٹ کو قبول کر لے گی۔

۱۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ۱/۳ نشستیں دی جائیں۔
۲۔ آئین وفاقی ہو اور باقی ماندہ اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں۔
۳۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے۔

لیکن قائداعظم کی یہ اپیل صدا بہ صحرا ثابت ہوئی اور مہاسبھا کے نمائندہ جے کار نے قائداعظم کے متعلق کہا کہ "جناح ایک ضدی بچے کی مانند ہے جس کا دماغ کانگرس کے لاڈ پیار کی وجہ سے خراب ہو گیا ہے۔" اس نے دھمکی دی کہ اگر رپورٹ کے ایک شوشے میں بھی تبدیلی کی گئی تو وہ اسے مسترد کر دے گا۔ اس دھمکی سے مرعوب ہو کر کانگرس نے مسلمانوں سے تعاون کا آخری موقع بھی کھو دیا۔ نہرو رپورٹ کو مسلم لیگ اور دیگر مسلمان جماعتوں نے انصاف اور حقیقت پسندی کے خلاف سمجھتے ہوئے رد کر دیا۔

کانگرس کا میثاق لکھنؤ سے انحراف دراصل ۱۹۲۷ء کے انتخابات میں اپنی ناکامی اور ہندو مہاسبھا کی کامیابی کی وجہ سے تھا۔ کانگرس نے ہندوؤں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں سے تعاون کی بجائے ان کی مخالفت کی روش اختیار کرنا ضروری سمجھا۔

اثرات

۱۔ ہندو مسلم تعاون کا خاتمہ: ہندو مسلم تعلقات کے ضمن میں نہرو رپورٹ بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس رپورٹ کی بدولت ہندو ذہنیت کھل کر سامنے آگئی۔ اور دونوں قوموں میں اتفاق کی بجائے نفاق پیدا ہوا۔ مسلمانوں پر واضح ہو گیا کہ ہندوؤں کو ان کے مفادات سے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ محض اکثریت کے بل بوتے پر اپنی مرضی کا نظام مسلمانوں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوؤں نے میثاق لکھنؤ اور تجاویز دہلی کو مسترد کر کے ہندو مسلم اتحاد کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

۲۔ مسلمان لیڈروں کی مایوسی: قائداعظم اور محمد علی جوہر کو اس رپورٹ سے سخت صدمہ پہنچا کیونکہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست داعی تھے۔ انہیں اس امر کا شدید احساس ہوا کہ ہندو مسلم اتحاد کا خواب اب ہندوؤں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قائداعظم نے اشکبار آنکھوں سے کہا کہ اب ہمارے راستے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ہیں۔ مولانا شوکت علی نے رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ جوانی میں مجھے کتے پالنے کا بہت شوق تھا لیکن میں نے کبھی کسی شکاری کتے کو خرگوش کے

ساتھ ایسا سلوک کرتے نہیں دیکھا جیسا نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔

۳۔ متفقہ آئین بنانے میں ناکامی: نہرو کمیٹی کا مقصد وزیر ہند کے چیلنج کے جواب میں متفقہ دستوری خاکہ پیش کرنا تھا لیکن اس مقصد میں وہ بری طرح ناکام ہوئی۔ اور اس طرح وزیر ہند کی بات درست ثابت ہوئی۔

۴۔ ہندو مسلم فسادات میں اضافہ: نہرو رپورٹ نے ہندو مسلم کشیدگی پر مہر لگا دی اور ہندوستان سے امن ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔ دونوں قوموں کے درمیان فسادات میں اضافہ ہو گیا۔

۵۔ اتحاد کی ضرورت کا احساس: نہرو رپورٹ کا ایک خوش کن پہلو یہ بھی تھا کہ اس سے پیدا ہونے والی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کی منتشر صفوں کو متحد کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ چنانچہ دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا انعقاد اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

۶۔ نیشنلسٹ گروہ کی علیحدگی: اس موقع پر مسلمانوں کے باہمی اختلافات نے ایک مستقل صورت اختیار کر لی۔ مسلمانوں کا ایک مختصر گروہ جو نیشنلسٹ کہلاتا تھا مولانا ابوالکلام کی قیادت میں غیر مشروط طور پر کانگرس میں شامل ہو گیا۔

قائداعظم کے چودہ نکات

نہرو رپورٹ نے ہندو مسلم اختلافات کا حل تلاش کرنے کی بجائے ان مسائل کو مزید الجھا دیا۔ ہندوؤں نے میثاق لکھنؤ میں مسلمانوں کے جن مطالبات کو تسلیم کیا تھا۔ اب انہیں یکسر مسترد کر دیا۔ ہندوؤں کی ہٹ دھرمی اور تعصب نے قائداعظم کو ہندو مسلم اتحاد سے بالکل مایوس کر دیا۔ لہٰذا آپ نے نہرو رپورٹ سے پیدا ہونے والی صورت حال پر غور کرنے کے لئے مسلم لیگ کا اجلاس مارچ ۱۹۲۹ء میں دہلی میں بلایا۔ جس میں شفیع لیگ نے بھی شرکت کی۔ اس طرح مسلم لیگ دوبارہ متحد ہو گئی۔ اس اجلاس میں قائداعظم نے ایک قرارداد پیش کی جو تاریخ میں قائداعظم کے چودہ نکات کے نام سے مشہور ہے۔ ان نکات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ ملک کا آئین وفاقی ہو اور باقی ماندہ اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں۔
۲۔ تمام صوبوں کو یکساں حکومت خود اختیاری دی جائے۔
۳۔ ہر صوبے میں اقلیتوں کو نمائندگی دی جائے۔ لیکن کسی فرقہ کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل نہ کیا جائے۔
۴۔ مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی سے کم نہ ہو۔
۵۔ جداگانہ طرز انتخاب کا طریقہ جاری رہے لیکن ہر فرقہ کو اختیار ہو کہ وہ اپنی مرضی سے مخلوط طریقہ انتخاب اختیار کرے۔
۶۔ صوبوں کی حدود میں کوئی ایسی تبدیلی نہ کی جائے جس سے صوبہ سرحد، پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت متاثر ہو۔
۷۔ تمام فرقوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو۔
۸۔ قانون ساز مجلسوں میں کوئی ایسا مسودہ قانون منظور نہ کیا جائے جس کی مخالفت کسی ایک فرقے کے ۳/۴ ارکان کریں۔
۹۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔
۱۰۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھی دیگر صوبوں کی طرح آئینی اصلاحات نافذ کی جائیں۔
۱۱۔ مسلمانوں کو بشرط قابلیت سرکاری اور خود مختار اداروں میں دیگر قوموں کے ساتھ ذمہ دار عہدوں پر فائز کیا جائے۔
۱۲۔ آئین میں مسلم تمدن، تعلیم، زبان، مذہب، شرعی قوانین اور خیراتی اداروں کو تحفظ دیا جائے اور انہیں حکومت کی طرف سے امداد دی جائے۔
۱۳۔ مرکز اور صوبوں میں کوئی ایسی وزارت نہ قائم کی جائے جس میں ایک تہائی مسلمان نہ ہوں۔
۱۴۔ صوبوں کی منظوری کے بغیر مرکزی مجلس قانون ساز آئین میں تبدیلی کی مجاز نہ ہو۔

چودہ نکات کی اہمیت

قائداعظم کے چودہ نکات برصغیر کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کو جمعیت علمائے ہند نے بھی اپنے سالانہ اجلاس میں منظور کر لیا۔ ہندو مسلم تعلقات پر ان کے دور رس نتائج مرتب ہوئے اور آئندہ پانچ سال تک یہ دونوں قوموں کے درمیان سیاسی گفت و شنید کا موضوع بنے رہے۔

۱۔ مسلمانوں کی ترجمانی: قائداعظم کے چودہ نکات مسلمانوں کے جذبات اور مطالبات کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد وہ شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ ملک کے آئینی مسائل کے بارے میں ان کے خیالات کی جامع اور مربوط ترجمانی ضروری ہے۔ چنانچہ ان کی اشاعت پر مسلمانوں نے دلی مسرت کا اظہار کیا۔

۲۔ نہرو رپورٹ کا جواب: قائداعظم کے چودہ نکات نہرو رپورٹ کے جواب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندو نہرو رپورٹ کے متفقہ آئینی تجاویز ہونے کا دعویٰ کر رہے تھے۔ ان نکات نے کانگرس کے جھوٹ کی قلعی کھول دی۔

۳۔ مسلم لیگ کا اتحاد: تجاویز دہلی کی اشاعت کے بعد مسلم لیگ دو دھڑوں میں بٹ گئی تھی۔ دو سال کے اختلاف کے بعد ان میں دوبارہ اتحاد پیدا ہو گیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو ذہنی انتشار سے نکال کر درست سمت کی طرف گامزن کر دیا۔

۴۔ ہندوؤں کا رد عمل: چودہ نکات کے خلاف ہندوؤں کا رد عمل بڑا شدید تھا۔ ہندو مہاسبھا کے لیڈر ڈاکٹر مونجے نے ان کو ہندوستانی قومیت کے منافی قرار دیا اور یہ کہا کہ اگر برطانوی حکومت نے ان پر عمل کیا تو ہندوستان کی وحدت ختم ہو جائے گی۔

ہندوؤں نے سندھ کے الگ صوبہ کے قیام کو ایک عیاشی قرار دیا اور چودہ نکات نے یہ بات واضح کر دی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے راستے جدا ہیں۔

۵۔ ہندو مسلم اختلافات: نہرو رپورٹ اور قائد اعظم کے چودہ نکات برصغیر کے سیاسی مسائل کے بارے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں ان تجاویز کے تضاد نے ثابت کر دیا کہ دونوں قوموں میں ملک کے آئندہ سیاسی ڈھانچہ کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔

۶۔ مطالبہ پاکستان کا نقطہ آغاز: چودہ نکات پر ہندو رد عمل نے یہ بات واضح کر دی کہ ہندوؤں کے ساتھ تعاون کر کے مسلمان اپنے حقوق و مفادات کا تحفظ نہیں کر سکتے بلکہ انہیں خود اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرنا ہو گا۔ جب ہندوؤں نے ان نکات کو ہندوستانی قومیت اور ملکی اتحاد کے منافی قرار دے کر مسترد کر دیا اور ان کی شدید مخالفت شروع کر دی تو مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کے مطالبے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔ اس طرح مطالبہ پاکستان کے ضمن میں چودہ نکات سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گول میز کانفرنسیں

جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں آئینی معاملات پر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا تو حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کہ وہ ہندوستان کے نمائندوں پر مشتمل ایک کانفرنس لندن میں طلب کرے گی جس میں باہمی گفت و شنید کے ذریعے دستوری مسائل کا حل تلاش کیا جائے گا۔ اس موقع پر کانگرس نے اعلان کر دیا کہ حکومت ۳۱ دسمبر ۱۹۳۰ء تک نہرو رپورٹ کو ہندوستان کے آئین کے طور پر تسلیم کر لے ورنہ وہ سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دے گی۔

پہلی گول میز کانفرنس

کانگرس کی مخالفت اور بائیکاٹ کے باوجود گول میز کانفرنس کا پہلا اجلاس ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو شروع ہوا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ مہاسبھا کے نمائندے ہندو نقطہ نظر کی ترجمانی کے لیے کانفرنس میں موجود تھے۔ مسلم وفد کی قیادت سر آغا خان نے کی۔ مختلف امور پر غور کرنے کے لیے آٹھ سب کمیٹیاں بنائی گئیں۔ جن میں وفاقی امور اور اقلیتی امور کی کمیٹیاں اہم ترین تھیں۔ لیکن ان میں اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ یہ کانفرنس ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو ختم ہوئی۔ اس کے اختتام پر وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ نے اعلان کیا کہ حکومت صوبوں میں مکمل خود اختیاری اور مرکز میں ذمہ دار حکومت جس میں دو عملی کا کچھ حصہ شامل ہو' کے اصول تسلیم کرتی ہے۔

گاندھی اروِن پیکٹ

حکومت نے محسوس کیا کہ کانفرنس میں کانگرس کی غیر موجودگی سے اس کی اہمیت کم ہو

جائے گی۔ اس لیے اس نے کانفرنس میں اس کو شریک کرنے کے لیے گاندھی کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔ اور مارچ ۱۹۳۱ء میں وائسرائے لارڈ ارون اور گاندھی کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ جسے گاندھی ارون پیکٹ کہا جاتا ہے۔ اس کی رو سے طے پایا کہ کانگرس سول نافرمانی کی تحریک ختم کر کے گول میز کانفرنس میں شرکت کرے گی۔ چنانچہ حکومت نے سول نافرمانی کے نظر بندوں کو رہا کرنے کا اعلان کر دیا۔

دوسری گول میز کانفرنس

گول میز کانفرنس کا دوسرا دور ۷ ستمبر ۱۹۳۱ء سے شروع ہوا اور یکم دسمبر تک جاری رہا۔ گاندھی نے اس اجلاس میں کانگرس کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی۔

کانگرس کے اہم ترین معاملات وفاقی کمیٹی اور اقلیتی کمیٹی کے سپرد تھے۔ گاندھی دونوں کمیٹیوں کا رکن تھا۔ اقلیتی امور کی کمیٹی میں تمام قوموں کے حقوق کے بارے میں جتنی تجاویز بھی پیش کی گئیں گاندھی نے انہیں یہ کہہ کر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ مختلف قوموں کے درمیان نفرت انگریز حکومت کی پیدا کردہ ہے۔ وہ انگریزوں کی آمد سے پہلے مل جل کر زندگی گزار رہی تھیں۔ اس لیے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد یہ عداوت خود بخود ختم ہو جائے گی۔ لہٰذا مسلمانوں یا کسی دوسری قوم کے حقوق کے تحفظ کے لیے آئینی اقدامات کی ضرورت نہیں

گاندھی نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ وہ سارے برصغیر کا واحد نمائندہ ہے۔ کیونکہ کانگرس بلا امتیاز مذہب و ملت تمام ملک کی نمائندہ جماعت ہے۔ اس طرح گاندھی نے یہ عجیب منطق پیش کی کہ اس کے سوا کوئی بھی رکن ہندوستان کا نمائندہ نہیں ہے۔

گاندھی کی ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے اقلیتی امور کی کمیٹی کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکی۔ اس پر مسلمانوں' اچھوتوں' سکھوں اور عیسائیوں کے نمائندوں نے مل کر ایک سمجھوتہ کیا۔ جس میں تمام فریقوں نے جداگانہ انتخاب کی حمایت کی۔

گاندھی کے افسوسناک رویے کی وجہ سے دوسری کانفرنس بھی ناکام ہو گئی۔ اس کانفرنس میں سندھ کو بمبئی سے الگ کرنے اور سرحدی صوبہ میں اصلاحات نافذ کرنے کے مطالبات اصولی طور پر تسلیم کر لیے گئے۔

کمیونل ایوارڈ

لندن سے واپسی پر کانگرس نے سول نافرمانی کی تحریک دوبارہ شروع کر دی۔ جس پر حکومت نے گاندھی سمیت دوسرے کانگرس لیڈروں کو قید کر دیا۔

چونکہ ہندوستانی راہنما فرقہ وارانہ مسائل کا متفقہ حل تلاش کرنے میں ناکام رہے تھے۔ اس لیے حکومت نے اگست ۱۹۳۲ء میں کمیونل ایوارڈ شائع کیا جس کی رو سے مسلمانوں اور تمام دوسری اقلیتوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کر لیا گیا۔

پونا پیکٹ

کیمونل ایوارڈ میں اچھوتوں کو جداگانہ انتخابات کا حق دیئے جانے پر ہندو خاص طور پر بہت برہم ہوئے اور گاندھی نے اس فیصلہ کے خلاف جیل ہی میں مرن بھرت رکھ لیا۔ ہندوؤں نے اچھوتوں کے لیڈر ڈاکٹر امبیدکر پر بہت دباؤ ڈالا اور بالآخر پونا کے مقام پر اس نے ایک معاہدہ کی رو سے جداگانہ انتخابات سے دست بردار ہونے کا اعلان کر دیا اور نتیجتاً مخلوط انتخابات کے تحت اچھوتوں کے لیے چند نشستیں مخصوص کر دی گئیں۔ حکومت نے بھی پونا پیکٹ تسلیم کر لیا۔

تیسری گول میز کانفرنس

تیسری گول میز کانفرنس ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء کو شروع ہوئی اور ۲۴ دسمبر تک جاری رہی۔ اس اجلاس میں کانگرس نے شرکت نہ کی۔ قائداعظم بھی اس کانفرنس میں شریک نہ ہوئے۔ اس لیے چند نشستوں کے بعد یہ کانفرنس بھی کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی۔

اثرات

گول میز کانفرنسیں ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ ملک کے مسائل کا متفقہ حل تلاش کرنے کے لیے بلائی گئی تھیں۔ لیکن ان کے نتیجے کے طور پر باہمی اختلافات اور فرقہ وارانہ کشیدگی میں بہت اضافہ ہوا اور مفاہمت کے امکانات ختم ہو گئے۔

کانفرنس میں ہندو ذہنیت کھل کر مسلمانوں کے سامنے آگئی۔ گاندھی نے مسلمانوں کو الگ قوم تسلیم کرنے سے مسلسل انکار کیا۔ اس طرح مسلمانوں پر واضح ہو گیا کہ ہندو مسلمانوں کو کوئی حق دینے پر آمادہ نہیں اور وہ انہیں اپنے رحم و کرم پر رکھنا چاہتے تھے۔

گول میز کانفرنسوں میں برطانوی لیڈروں کو ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں سے گفت و شنید کا براہ راست موقع ملا۔ جس کی وجہ سے انہیں برصغیر کے مختلف نمائندوں کے خیالات سے آگاہی ہوئی۔ اس طرح برطانوی حکومت کے لیے سیاسی مسائل کے حل میں آسانی پیدا ہوئی۔

خطبہ الٰہ آباد

علامہ اقبال دورِ حاضر کے ایک عظیم مفکر تھے۔ آپ نے مسلمانوں کو ان کی عظمتِ رفتہ یاد دلائی اور ان میں مایوسی ختم کر کے خود اعتمادی پیدا کی۔ آپ نے اسلامی اقدار کے احیاء پر زور دیا اور مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر مسلسل جدوجہد کا درس دیا۔

سیاسی لحاظ سے آپ کا سب سے اہم کارنامہ وہ صدارتی خطبہ ہے۔ جو آپ نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں الٰہ آباد کے مقام پر دیا۔ علامہ اقبال کی یہ تقریر اسلام کے فلسفۂ حیات پر بہترین دستاویز ہے۔ آپ نے نہایت مدلل اور موثر انداز میں اسلام کی ابدیت،

دو قومی نظریہ اور مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ پیش کیا۔ آپ کا یہ خطاب مسلمانوں کی جدوجہد آزادی اور ان کی قومی تاریخ میں ایک عظیم فکری سرمایہ ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال کو بجا طور پر تصورِ پاکستان کا خالق کہا جاتا ہے۔ آپ کے خطبہ کے اہم نکات درج ذیل ہیں۔

۱۔ اسلام ایک زندہ قوت ہے: "جس شخص کو آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے اعزاز سے نوازا ہے۔ وہ اب بھی اسلام کو ایک زندہ طاقت سمجھتا ہے۔ وہ طاقت جو انسان کے ذہن کو وطن اور نسل کے تصور کی قید سے نجات دلا سکتی ہے۔ اسلام ریاست اور فرد دونوں کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ یہ دستورِ حیات ہے اور ایک نظام ہے۔ بس یہی وہ بات ہے کہ ہم اگر اسے پالیں تو مستقبل میں ہندوستان کی ایک نمایاں تہذیب کے علمبردار بن سکتے ہیں۔"

۲۔ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے: "اسلام چند عقائد کا نام نہیں' یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یورپ میں مذہب ایک فرد کا ذاتی معاملہ ہے جو انسانی وحدت کو دو متصادم حصوں یعنی روح اور مادہ میں تقسیم کرتا ہے۔ اسلام میں خدا کائنات روح اور مادہ' ریاست و کلیسا ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ میرا یقین ہے کہ فرد اور ریاست کی زندگی میں مذہب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اسلام بذات خود تقدیر ہے وہ کسی تقدیر کے تابع نہیں۔"

۳۔ متحدہ قومیت کی تردید: برصغیر میں متحدہ قومیت کے تصور کو رد کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔ "ہندوستان ایسے انسانی گروہوں کا براعظم ہے جو مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مختلف زبانیں بولتے اور مختلف مذاہب کے پیروکار ہیں۔"

ہندوستان کے مختلف مذاہب اور مختلف ذاتوں میں اس قسم کا کوئی رجحان موجود نہیں کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت کو فراموش کر کے ایک وسیع اکائی کی صورت اختیار کر لیں۔

"ہم ایک دوسرے پر شک کرتے ہیں اور درپردہ ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ہم اپنی خود غرضی کو قوم پرستی کے لبادہ میں چھپاتے ہیں۔"

۴۔ اختلافات ایک حقیقت ہیں: علامہ اقبال نے ہندوستان میں موجود زبان' نسل' ثقافتی اختلافات اور فرقہ واریت کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ "ان اختلافات کو تسلیم کر لینا ہی مسائل کا بہترین حل ہے۔ اس کے بغیر کوئی سیاسی نظام یہاں

ہر وہ دستور جو ہندوستان کی واحد قوم کے تصور پر تیار کیا جائے گا جس کا مقصد یہ ہو گا کہ یہاں ایسے اصولوں کا نفاذ کیا جائے جو برطانیہ کے جذبہ جمہوریت کی پیداوار ہوں تو اس کا مطلب ہندوستان کو نادانستہ طور پر خانہ جنگی کی طرف لے جانا ہو گا۔"

۵۔ مسلمان ایک قوم ہیں: ہندوستان کے مسلمان یہاں کی دوسری قوموں سے مختلف ہیں۔ ان کی انفرادیت کی وجہ ان کی تہذیب و تمدن' ثقافت' ضابطہ حیات اور اخلاقی تصورات ہیں۔ اپنے عقائد کے مطابق ترقی پانا یقیناً فرقہ وارانہ تنگ

نظری نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں صرف مسلمانوں کو ہی جدید ترین معانی میں قوم کہا جا سکتا ہے۔ ہندو اگرچہ ہر چیز میں ہم سے آگے ہیں۔ مگر وہ اپنے اندر وہ یکسانیت نہیں پیدا کر سکے جو ایک قوم کے لیے ضروری ہے۔"

٦۔ مسلم ریاست کی ضرورت: "اسلامی قانون کے طویل و گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس قانون کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کیا جائے تو ہر شخص کے لیے کم از کم حق معاش محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن شریعت کا نفاذ اور ارتقاء ایک آزاد مسلم ریاست کے بغیر اس ملک میں ممکن نہیں۔"

٧۔ علیحدہ ملک کا مطالبہ: ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا "میں چاہتا ہوں کہ پنجاب، سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔ جو برطانوی سلطنت کے اندر رہو یا باہر مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ شمالی مغرب میں مسلم ریاست کا قیام مسلمانوں کا مقدر بن چکا ہے۔ اس ملک میں اسلام کی بقا کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرتکز کر دیا جائے۔ اس بنا پر میں مطالبہ کرتا ہوں کہ برصغیر اور اسلام کے مفاد کے پیش نظر ایک مستحکم مسلم ریاست قائم کی جائے۔ یہ امر ہندوستان کے لیے اندرونی توازن اور امن و سکون کا علمبردار ہو گا۔ اور مسلمانوں کے لیے اسلامی قانون، تعلیم اور ثقافت کو دور جدید کے تقاضوں کے مطابق ترقی دینے کا موقعہ فراہم کرے گا۔

٨۔ ضرورت اتحاد: مسلمانوں کو اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے آپ نے فرمایا "میں فرقہ وارانہ مسائل کے تصفیہ سے نا امید نہیں ہوں۔ لیکن آپ سے یہ احساس چھپا بھی نہیں سکتا کہ موجودہ نازک حالات کے ازالہ کے لیے مستقل قریب میں آزادانہ جدوجہد صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب پوری قوم میں اس کا عزم موجود ہو اور ان کے تمام ادارے ایک مرکز پر مرکوز ہوں۔"

٩۔ اسلام وسیلہ کامرانی: "ایک سبق جو میں نے اسلامی تاریخ سے سیکھا ہے۔ یہ ہے کہ آڑے وقتوں میں اسلام نے مسلمانوں کو بچایا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی ہے۔ اگر آج آپ اپنی نظریں اسلام پر لگا دیں اور اس کے زندگی پرور تخیل سے اثر لیں تو آپ کی منتشر قوتیں از سر نو یکجا ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت اور بربادی سے بچ جائے گا۔"

اہمیت

برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی میں علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تقسیم ہند کی تجویز پہلی دفعہ علامہ اقبال نے پیش نہیں کی بلکہ اس سے پہلے کئی مسلم راہنما اس کی طرف اشارہ کر چکے تھے مگر مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے مطالبے کو مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر سب سے پہلے نہایت مدلل اور واضح الفاظ میں پیش کرنے کا سہرا علامہ اقبال ہی کے سر ہے۔

اسلامی نظریہ حیات کی برتری: علامہ اقبال کا یہ خطبہ اسلامی نظریہ حیات پر ایک اہم دستاویز اور ہماری قومی تاریخ کا انتہائی اہم سرمایہ ہے۔

اس میں آپ نے نہ صرف اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات قرار دیا بلکہ اسے جدید دور میں بھی قابل عمل اور بنی نوع انسان کے تمام مسائل کا حل قرار دیا۔

دو قومی نظریہ کی وضاحت: خطبہ الہ آباد میں آپ نے متحدہ قومیت کے بت کو پاش پاش کر دیا۔ آپ نے اسلام کو قومیت کی بنیاد قرار دیا اور مسلمانوں کے نظریہ قومیت کی دوسرے نظریات پر فوقیت ثابت کی علامہ نے متحدہ قومیت کے تصور کو مسترد کرتے ہوئے فرمایا کہ ہندوستان میں ایسے کوئی جذبات موجود نہیں اور نہ ہی یہ خیال قابل عمل ہے۔

منزل کی نشاندہی: علامہ اقبال نے ہندوستان میں بسنے والی مختلف قوموں کے درمیان اختلافات کی وضاحت کرتے ہوئے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ پیش کیا اور ہندوستان کی تقسیم کو نہ صرف سیاسی مسائل کا حل قرار دیا بلکہ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کے لیے ضروری قرار دیا۔

ہندوؤں کا رد عمل: علامہ اقبال کے خطبے پر ہندوؤں کا رد عمل بڑا شدید تھا۔ انہوں نے علیحدہ وطن کے مطالبے پر شدید تنقید کی۔ ہندو پریس نے اسے "پان اسلام ازم" کی ایک سازش قرار دیا اور کہا کہ مسلمان شمال مغرب میں اسلامی ریاست قائم کر کے افغانستان، ایران اور ترکی کی مدد سے پورے برصغیر پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

مسلم سیاست کا نیا رخ: خطبہ الہ آباد مسلمانوں کی امنگوں کا ترجمان تھا۔ اس نے انہیں فکر و عمل کی نئی راہ دکھائیں۔ اور ان میں نیا عزم جوش اور ولولہ پیدا کیا۔ اگرچہ ابتداء میں اسے ایک فلسفی کا ناقابل عمل نظریہ اور شاعر کا خواب بھی کہا گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ مسلمانان برصغیر کے دلوں کی دھڑکن بن گیا۔ اور انہوں نے علیحدہ وطن کا مطالبہ اپنا نصب العین قرار دیا۔ ١٤ اگست ١٩٤٧ء کو شاعر کا یہ خواب دنیا کے نقشہ پر حقیقت بن کر ابھرا۔

کانگرس راج میں مسلمانوں کی حالت

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت ہندوستان میں مارچ ۱۹۳۷ء میں صوبائی انتخابات منعقد ہوئے اور کانگرس کو گیارہ میں سے پانچ صوبوں میں قطعی اکثریت حاصل ہو گئی۔ کچھ گروپوں کو ساتھ ملانے کے بعد ساتھوں صوبوں میں کانگرس کی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اس طرح کانگرسی راج جولائی ۱۹۳۷ء سے اکتوبر ۱۹۳۹ء تک ملک کے بیشتر حصے پر قائم رہا۔ اور کانگرس کو اپنی پالیسیاں نافذ کرنے کا عملی موقع ملا۔ اقتدار کے نشے میں کانگرس نے ایسا نامعقول رویہ اختیار کیا کہ مسلمانوں کے بارے میں اس کے قول و فعل کا تضاد کھل کر سامنے آگیا اور مسلمانوں پر کانگرس کا اصل روپ بے نقاب ہو گیا۔

کانگرسی دور میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کی تفصیل ہمیں پیرپور رپورٹ، شریف رپورٹ اور مولوی فضل حق کی تصنیف "یہ پھر کبھی نہیں ہوگا" میں ملتی ہے۔ کانگرسی وزارتوں کے دور میں مسلمانوں کی جو حالت زار ہوئی اس کا جائزہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ مخلوط وزارتیں بنانے سے انکار: کانگرس کو مسلم حلقوں میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے صوبوں میں فرقہ وارانہ ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے وزارتوں میں مسلم لیگ کو نمائندگی دینا کانگرس کا اخلاقی فرض تھا۔ لیکن انتخابات میں غیر متوقع کامیابی کی وجہ سے کانگرس نے مسلم لیگ کو ساتھ ملا کر وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا۔ یو۔ پی میں مسلم لیگ کے نمائندوں کو صرف اس شرط پر وزارت میں شمولیت کی پیش کش کی گئی کہ وہ مسلم لیگ کو چھوڑ کر کانگرس میں شامل ہو جائیں۔

۲۔ مسلم لیگ کو ختم کرنے کی کوشش: کانگرسی لیڈر مسلم لیگ کو متحدہ ہندوستانی قومیت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مسلم لیگ کے سوا کوئی ایسی جماعت نہیں جو مسلمانوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر سکے۔

چنانچہ جن صوبوں میں کانگرس نے غیر لیگی ارکان کو ساتھ ملا کر مخلوط وزارتیں بنائیں ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ وزارت میں شمولیت کی خاطر اپنی پارٹی کو چھوڑ دیں جیسا کہ یو پی میں کیا گیا تھا۔

۳۔ مسلم عوام رابطہ مہم: انتخابات میں مسلم حلقوں میں ناکامی کے بعد کانگرس نے ان علاقوں میں مسلم لیگ سے تعاون کی بجائے مسلمانوں کو کانگرس کے زیر اثر لانے کے لیے مسلم عوام رابطہ مہم شروع کی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اعلان کیا

ہندوستان کے مسائل اقتصادی ہیں۔ لہٰذا مذہبی فرقہ بندی کو نظر انداز کر کے معاشرتی اور معاشی خوشحالی کی بنیاد پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں تعاون ممکن ہے لیکن اس مہم کے اصل مقاصد مسلم لیگ کا خاتمہ، مسلم قائدین سے مسلمانوں کو بدظن کرنا اور مسلمانوں میں اختلاف پیدا کر کے انہیں کمزور کر دینا تھا۔ مگر مسلمان کانگرس کے قریب آنے کی بجائے اس سے بدظن ہو گئے۔ کیونکہ اس مہم سے یہ تاثر عام ہو گیا کہ کانگرس مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنا چاہتی ہے۔

۴۔ انتظامیہ کے کام میں مداخلت: کانگرس نے اپنے کارکنوں میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ وہ حکمران ہیں۔ چنانچہ کانگرس کا ہر ممبر اپنے آپ کو حکومت کا ایک رکن سمجھتا تھا۔ یو پی کے چیف سیکرٹری نے ضلعی حکام کو یہ ہدایت بھیجی کہ وہ تمام اہم اقدامات سے پہلے کانگرسی کمیٹیوں سے مشورہ کریں۔ ان تمام سرگرمیوں کو مسلمان بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانگرس نے ایک متوازی حکومت قائم کر لی ہے۔

۵۔ عدلیہ پر اثر انداز ہونے کی کوشش: کانگرس نے عدلیہ کی کارروائیوں میں بھی مداخلت کی۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ نے کانگرسی ایم ایل اے کے مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے لکھا کہ گذشتہ مہینے مختلف عدالتوں کو بااثر شخصیات نے کئی مقدمات میں کسی نہ کسی فریق کے حق میں خطوط لکھے۔ عدلیہ نے بھی ہندو ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرقہ وارانہ فسادات میں جانبداری سے کام لیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کو عدالتوں سے انصاف کی توقع نہ رہی۔

۶۔ بندے ماترم کا گیت: کانگرس نے برسر اقتدار آتے ہی بندے ماترم کے گیت کو قومی ترانے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا اور اسے کانگرس کے جلسوں کے علاوہ سرکاری تقریبات، سکولوں اور اسمبلی کے اجلاس میں بھی پڑھا جانے لگا۔ جب قائداعظم نے اس پر اعتراض کیا تو پنڈت نہرو نے جواب دیا کہ بندے ماترم کا گیت ہماری قومی جدوجہد سے وابستہ چلا آ رہا ہے اور اس کے ساتھ بہت سی یادیں اور قربانیاں پیوست ہو گئی ہیں۔

وزیر ہند نے بندے ماترم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ مسلمانوں کو یہ گیت پڑھنے پر مجبور کرنا ایسا ہی ہے جس طرح یوگوسلاویہ یا پولینڈ کے لوگوں سے کہا جائے کہ وہ ہٹلر زندہ باد کا نعرہ لگائیں۔

۷۔ ترنگا جھنڈا: کانگرسی راج کے دوران کانگرس کا ترنگا جھنڈا سرکاری عمارات پر لہرایا جانے لگا۔ سکولوں میں بچے اسے اسلامی دیتے تھے۔ ایک سیاسی پارٹی کے جھنڈے کو بطور قومی پرچم استعمال کیے جانے کی طرف جب قائداعظم نے پنڈت نہرو کی توجہ مبذول کرائی تو انہوں نے اس جھنڈے کو آرٹ کے نقطہ نظر سے حسین رنگوں کا امتزاج اور مختلف قوموں کے اتحاد کی علامت قرار دیا اور کہا کہ یہ لہراتا ہوا بھی خوبصورت لگتا ہے اس کے برعکس پنڈت نہرو نے مسلم لیگ کے پرچم ستارہ و ہلال کو فرقہ وارانہ جھنڈا قرار دیا۔

۸۔ اردو زبان: کانگرس نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اردو کی بجائے ہندوستانی زبان ملک

میں رائج کرنا شروع کردی۔ جو دراصل ہندی کا نیا نام تھا۔ اور اس میں سنسکرت کے الفاظ کی بھرمار تھی جو ہندوؤں کی سمجھ سے بھی بالاتر تھی کانگرس کے اس اقدام سے مسلمانوں کے تہذیبی اور ثقافتی ورثہ کو خطرہ پیدا ہوگیا جو کہ اردو میں تھا۔

۹۔ واردھا سکیم: کانگرس نے ایک طویل منصوبہ بندی کے تحت مسلمانوں کو ہندو معاشرے میں جذب کرنے کے لیے واردھا سکیم کے نام سے ایک تعلیمی منصوبہ شروع کیا۔ اہنسا اور وطن پرستی اس سکیم کے بنیادی اصول تھے۔ نئی درسی کتابوں میں متحدہ ہندوستانی قومیت کا پرچار کیا گیا اور سارے مذاہب کو سچا بتایا گیا۔ الغرض یہ سکیم مسلمانوں کے عقائد، ثقافت، تمدن اور علیحدہ تشخص کو تباہ کرکے مسلمان بچوں کے ذہنوں میں ہندی کلچر کی برتری کا خیال پیدا کرنے کی ایک خطرناک سازش تھی۔

۱۰۔ ودیا مندر سکیم: سی۔ پی کے صوبے میں ودیا مندر کے نام سے ایک تعلیمی منصوبہ تیار کیا گیا۔ جس کے تحت پرائمری تعلیم مندروں میں دینے کا پروگرام تھا۔ اس سکیم کا مقصد مسلمان بچوں کے دلوں میں مورتیوں کا احترام پیدا کرنا اور انہیں ہندو رسومات کو غیر شعوری طور پر قبول کرنے کے لیے تیار کرنا تھا

۱۱۔ گاندھی کی مورتی کی پوجا: کانگرسی راج کے دوران سکولوں میں گاندھی کی مورتی نصب کرکے اس کی پوجا کی جانے لگی اور مسلمان بچوں کو بھی ایسا کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

۱۲۔ ہندو مسلم فسادات میں اضافہ: کانگرسی وزارتوں کے قیام کے ساتھ ہی ہندو مسلم فسادات میں بہت اضافہ ہوا اس کے علاوہ ڈکیتی اور لوٹ مار کے وارداتیں بھی زیادہ ہو گئیں۔ مساجد کے سامنے باجے بجانے اور گائے کو ذبح کرنے کے معاملات پر خونریزی تک نوبت پہنچ جاتی۔ کانگرسی حکام شرپسندوں کی پشت پناہی کرتے اور وہ سزا سے بچ جاتے۔ مسلمانوں کی جان و مال اور عزت ہندوؤں کے ہاتھوں سے محفوظ نہ رہی۔ ناگپور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے لکھا کہ مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا کرنے میں حکومت ہندوؤں کے ساتھ ہو گئی ہے کئی مسلمانوں پر صرف اس لیے عتاب نازل ہوا کہ وہ مسلمان تھے۔

۱۳۔ معاشی بد حالی: اقتصادی میدان میں مسلمان پہلے ہی پس ماندہ تھے۔ اس دور میں ان کی بد حالی میں اور اضافہ ہوا۔ نہ صرف سرکاری ملازمت کا حصول مسلمانوں کے لیے بہت مشکل ہو گیا۔ بلکہ ہندو اپنے علاقوں میں مسلمانوں کی دکانوں کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اور وہ مسلمان دکانداروں سے اشیائے ضرورت نہیں خریدتے تھے تاکہ وہ اپنا کاروبار بند کردیں۔

۱۴۔ معاشرتی دباؤ: حکومت کے نشے میں ہندوؤں نے کھلم کھلا مسلمانوں سے نفرت کا اظہار کرنا شروع کردیا۔ انہیں اچھوت اور ملیچھ کہا جاتا۔ اس کے علاوہ ہندووانہ رسوم اختیار کرنے کے لیے ان پر معاشرتی دباؤ ڈالا جاتا۔

یوم نجات: مسلمانوں کو کانگرسی دور میں جن مشکل حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب اکتوبر ۱۹۳۹ء میں کانگرسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں تو مسلمانوں نے قائداعظم کی اپیل پر ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو یوم نجات منایا۔

کانگرسی راج کے اثرات

کانگرس کے سوا دو سالہ دور اقتدار کے بڑے گہرے اور دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ مسلمانوں پر اس کا ردعمل بڑا شدید تھا۔ کانگرسی راج نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔

ہندو ذہنیت کا عیاں ہونا: کانگرسی وزارتوں کے دور میں ہندو ذہنیت عریاں صورت میں سامنے آگئی۔ ہندوؤں کے طرز عمل سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مسلمانوں سے مسلم دور اقتدار کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ کانگرسی وزارتوں کے رویے نے دونوں قوموں کے تعلقات میں ایسی تلخیاں پیدا کردیں کہ جگہ جگہ فسادات ہوئے۔ کانگرس نے عملی طور پر ثابت کردیا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے اور ہندو اقتدار میں مسلمانوں کو حق و انصاف کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔

علیحدہ ملک کا مطالبہ: کانگرسی راج سے پہلے مسلمان صرف اپنے حقوق و مفادات کا تحفظ چاہتے تھے۔ لیکن انگریز حکمرانوں کی موجودگی میں محدود اختیارات ملنے کے بعد ہندوؤں نے مسلمانوں سے جو سلوک روا رکھا۔ اس سے مسلمانوں کو اندازہ ہوگیا کہ کانگرس کی قیادت میں آزادی ملنے کے بعد ان کا حشر کیا ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے مفادات کے تحفظ کی بجائے اپنے لیے علیحدہ ملک کا مطالبہ شروع کردیا۔

قرارداد لاہور

قائداعظمؒ نے ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔"

پروفیسر ٹائن بی نے درست کہا ہے کہ "پاکستان ایک لمبے تاریخی عمل کا نتیجہ ہے اور اس عمل کا آغاز اس وقت ہوا جب ہندو معاشرے پر اسلام کے اثرات مرتب ہونے لگے۔"

پس منظر: پاکستان کا قیام کسی اچانک حادثہ کی پیداوار نہیں بلکہ یہ حاصل ہے اس طویل جدوجہد کا جو مسلمانانِ ہند نے اپنے دین، تہذیب و تمدن، جداگانہ حیثیت کی بقا اور اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے کی۔ مسلمانوں سے پہلے جتنی قومیں بھی برصغیر میں آئیں وہ ہندو معاشرے میں جذب ہو گئیں۔ یہ امتیاز صرف مسلمانوں کو حاصل ہے کہ ہندو اکثریت میں آٹھ صدیاں گزارنے کے باوجود وہ ہندو تہذیب میں مدغم نہ ہوئے اور انہوں نے اپنا علیحدہ تشخص برقرار رکھا۔ مسلمان اور ہندو طویل عرصہ تک اکٹھا رہنے کے باوجود زندگی کے کسی معاملہ پر اکٹھے نہ ہو سکے۔ ان کے درمیان مذہبی، تہذیبی اور سیاسی اختلافات انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد بڑھتے چلے گئے۔ برصغیر کے حالات کا جائزہ لینے اور بالخصوص سوا دو سالہ کانگرسی دور اقتدار میں رام راج کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد مسلمان اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کا ہندوؤں کے ساتھ اس ملک میں اکٹھا رہنا ممکن نہیں۔

تقسیم ہند کی تجاویز: مسلمانوں میں ایک طبقہ پہلے سے ہی موجود تھا جس کے نزدیک ہندو مسلم

کشیدگی کا واحد حل ملک کی تقسیم تھا۔ اس سلسلے میں سید جمال الدین افغانی، مولانا عبدالحلیم شرر، خیری برادران اور آغا خان کی طرف سے تقسیم ہند کی تجاویز بھی پیش کی گئیں۔ لیکن مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے سب سے پہلے علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں اجلاس الٰہ آباد میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ریاست کا مطالبہ کیا۔ چوہدری رحمت علی نے ۱۹۳۳ء میں ہندوستان میں تین اسلامی ریاستوں یعنی پاکستان، عثمانستان اور بانگ اسلام کے قیام کی تجویز پیش کی۔ یہ اعزاز سندھ مسلم لیگ کو حاصل ہے کہ اس نے ۱۹۳۸ء میں مسلم اکثریت پر مشتمل ایک آزاد ملک کے حق میں باقاعدہ ایک قرارداد منظور کی۔

مسلم لیگ نے ۱۹۳۹ء میں مختلف آئینی تجاویز پر غور کرنے کے لیے قائداعظم کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی جس نے ان پر غور و فکر کے بعد مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک کے قیام کا مطالبہ کیا اور اسے ایک قرارداد کی صورت میں مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔

دو قومی نظریہ اور الگ مسلم ریاست کا جواز: قرارداد پیش کرنے سے ایک دن قبل ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو منٹو پارک (اقبال پارک) لاہور میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے دو قومی نظریہ کی وضاحت کی اور مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کے حق میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"برصغیر کا مسئلہ فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ اگر برطانوی حکومت ہندوستان میں حقیقی امن قائم کرنے کی خواہش مند ہے تو اس کی صرف ایک صورت ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کرکے بڑی اقوام کے لیے جداگانہ وطن بنا دیے جائیں۔ اسلام اور ہندومت دو الگ مذاہب ہی نہیں بلکہ دو جداگانہ نظام حیات ہیں یہ محض ایک خواب ہے کہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک مشترکہ قوم بن سکیں گے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کا تعلق دو مختلف مذہبی فلسفوں، معاشرتی رواجوں اور ادبیات سے ہے۔ نہ ان کے درمیان باہم شادیاں ہوتی ہیں اور نہ ہی یہ ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ ان کی تاریخ و تہذیب ایک دوسرے سے متصادم ہے۔ ایک قوم کا ہیرو دوسری قوم کا دشمن ہے اور ایک کی فتح دوسرے کی شکست ہے۔ ایسی دو قوموں کو ایک نظام میں باندھنے کا نتیجہ تباہی کی صورت میں نکلے گا۔ لفظ قوم کی ہر تعریف کی رو سے مسلمان ایک قوم ہیں۔ لہٰذا ان کے لیے ایک الگ وطن چاہیے جہاں وہ اپنے عقائد کے مطابق معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی گزار سکیں۔"

قرارداد: ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منٹو پارک لاہور میں ایک جلسہ عام میں مندرجہ ذیل تاریخی قرارداد پیش کی گئی۔

اس ملک میں کوئی دستوری خاکہ قابل عمل یا مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا جب تک وہ مندرجہ ذیل اصولوں پر مرتب نہ کیا جائے۔

"جغرافیائی لحاظ سے متصلہ علاقے الگ خطے بنا دیے جائیں اور جو علاقائی ردوبدل ضروری سمجھا جائے کر لیا جائے تاکہ ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں جن علاقوں میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے آزاد ریاستوں کی صورت میں اکٹھا کر دیا جائے جن کے اندر شامل ہونے والی اکائیاں خود مختار اور مقتدر ہوں۔"

مندرجہ بالا قرارداد شیر بنگال مولوی فضل حق نے پیش کی اور چوہدری خلیق الزماں نے اس کی تائید کی۔ بعد میں مختلف صوبوں سے تعلق رکھنے والے مندوبین نے اس کے حق میں تقریریں کیں۔

ہندوؤں کا ردعمل: قرارداد لاہور کے خلاف ہندو لیڈروں اور اخبارات کا ردعمل بڑا شدید تھا۔ ہندوستان ٹائمز نے لکھا کہ ایک فرقہ کو مطمئن کرنے کے لیے برصغیر کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا عوام کی ترقی اور سکون کو برباد کرنے کے مترادف ہے۔ گاندھی نے دو قومی نظریہ کو ایک جھوٹ قرار دیا اور تقسیم کو خودکشی قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ اس چیر پھاڑ میں شریک نہیں بنے گا۔" راج گوپال اچاریہ نے تقسیم ہند کی تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "جناح کا یہ مطالبہ اس طرح کا ہے جیسے دو بھائیوں میں ایک گائے کی ملکیت پر جھگڑا ہو اور وہ اپنی گائے کو دو ٹکڑوں میں بانٹ لیں۔"

قرارداد پاکستان: اس قرارداد میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا نام پاکستان تجویز نہیں کیا گیا تھا۔ صرف بیگم محمد علی جوہر نے قرارداد کی تائید میں تقریر کرتے ہوئے پاکستان کا لفظ استعمال کیا۔ لیکن ہندوؤں نے طنزاً اسے مطالبہ پاکستان قرار دیا۔ ہندوؤں کی اس مخالفانہ روش نے اس نام کو ایسی مقبولیت بخشی کہ مسلم لیگ کے کسی باقاعدہ فیصلہ کے بغیر ہی آزاد مسلم ریاست کا نام پاکستان قرار پایا اور قرارداد لاہور، قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہو گئی۔

اہمیت

قرارداد لاہور مسلمانوں کی جدوجہد آزادی میں بہت اہم مقام رکھتی ہے اور اس کی حیثیت سنگ میل کی ہے۔ اس نے مسلمانوں کی تگ و دو کا رخ مفادات کے تحفظ سے آزاد مسلم ریاست کے حصول کی طرف موڑ دیا۔

منزل کا تعین: قرارداد لاہور نے برصغیر کے مسلمانوں کی منزل کا تعین کر دیا اور پاکستان کا حصول ان کا نصب العین بن گیا۔ اس سے قبل مسلمان متحدہ ہندوستان میں اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لیے جدوجہد کرتے تھے۔ ہندوؤں کے رویے نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کریں۔ چنانچہ حقوق و مفادات کے حصول کی بجائے

علیحدہ ملک کا مطالبہ ان کی کوششوں کا محور بن گیا اور اس طرح ان کی قوت عمل میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

مسلمانوں میں اتحاد: پاکستان کے نام میں اتنی کشش تھی کہ جلد ہی یہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ پاکستان کے مطالبے نے برصغیر کے مسلمانوں میں اتحاد اور یک جہتی پیدا کر دی۔ آزاد اور خود مختار ملک کے حصول کی کوششوں میں ان علاقوں کے مسلمانوں نے بھی جوش و خروش سے حصہ لیا جن کو پاکستان میں شامل نہیں ہونا تھا۔

اسلامی ریاست کے قیام کی آرزو: خلافت راشدہ کی طرز پر اسلامی حکومت کا قیام ہمیشہ مسلمانوں کی آرزو رہی ہے۔ یہ تمنا اب پاکستان کی صورت میں پوری ہوتی نظر آتی تھی۔ قرارداد پاکستان چونکہ مسلمانوں کے دلوں کی ترجمانی کرتی تھی اس لیے اس نے ان میں بے پناہ جوش و خروش پیدا کر دیا اور وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو گئے اور ایک ہی نعرہ ہر زبان پر تھا

پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ

مسلم لیگ بطور مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت: قرار داد پاکستان کو سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی اور وہ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے اکٹھے ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بن گئی۔ مسلمانوں کی کوئی دوسری جماعت اب ان کی ترجمانی کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔

قائداعظم کی قیادت: قرار داد پاکستان کے بعد قائداعظم کی مقبولیت میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا۔ اور وہ جلد ہی سارے مسلمانوں کے جذبات کے ترجمان اور ان کے متفقہ لیڈر بن گئے۔ کوئی دوسرا مسلم راہنما ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ مسلمانان ہند آپ کے اشارے پر ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہو گئے۔ آپ کی بے مثال قیادت میں مسلمانوں نے بالآخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی منزل حاصل کر لی۔

1940 سے قیام پاکستان تک کے سیاسی حالات

مسلمانوں سے پہلے جتنی قومیں بھی ہندوستان میں آئیں وہ یہاں آ کر اپنا جداگانہ تشخص برقرار نہ رکھ سکیں بلکہ رفتہ رفتہ ہندو تہذیب میں جذب ہو گئیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے نہ صرف اپنی منفرد حیثیت برقرار رکھی بلکہ اسلامی تعلیمات نے ہندوؤں کو اتنا متاثر کیا کہ ان کی کثیر تعداد نے اسلام قبول کیا۔ اس طرح وہ نہ صرف نظریاتی طور پر اپنی قوم سے الگ ہو کر مسلم قوم کا ایک حصہ بن گئے بلکہ ان کی تہذیب و تمدن میں بھی انقلابی تبدیلیاں آئیں۔ اس طرح ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آ گئی جس کے نظریات، رسوم و رواجات اور ثقافت ہندوؤں سے مختلف تھے۔

برصغیر میں انگریزوں کی حکمرانی کے بعد ہندو مسلم کشمکش کا نیا دور شروع ہوا۔ جب ملک میں جمہوری ادارے قائم ہوئے تو مسلمانوں نے اپنے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے جدوجہد کی مگر کانگرسی راج کے دوران ان پر ظاہر ہو گیا کہ تنگ نظر اور متعصب ہندو اکثریت کی موجودگی میں یہ تحفظات بے معنی ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اپنے لیے ایک الگ ملک کا مطالبہ کیا۔

قرارداد پاکستان: رام راج کی ایک جھلک دیکھ لینے کے بعد مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر اس ملک میں نہیں رہ سکتے۔ اس لیے 23 مارچ 1940 کو لاہور میں مسلم لیگ کے جلسہ عام میں یہ قرارداد پیش کی گئی کہ اس ملک میں کوئی دستوری خاکہ قابل عمل یا مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو گا جب تک وہ مندرجہ ذیل اصول پر مرتب نہ کیا جائے۔

"جغرافیائی لحاظ سے متصل علاقے الگ خطے بنا دیے جائیں اور جو علاقائی رد و بدل ضروری سمجھا جائے، کر لیا جائے تاکہ ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں جن علاقوں میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے انہیں آزاد ریاستوں کی صورت میں اکٹھا کر دیا جائے جن کے اندر شامل ہونے والی اکائیاں خود مختار اور مقتدر ہوں۔"

قرارداد لاہور کو تحریک پاکستان میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس قرارداد نے مسلمانوں کی منزل متعین کر دی اور وہ آزاد ملک کے حصول کے لیے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے متحد ہو گئے۔

اگست 1940ء کی پیشکش: دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں کانگرس نے حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے صوبائی وزارتوں سے استعفیٰ دے دیا۔ حکومت جنگ کے ایام میں تمام جماعتوں کا تعاون چاہتی تھی لہٰذا 8 اگست 1940ء کو وائسرائے نے اعلان کیا کہ انتظامی کونسل کے ممبروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے گا اور ہندوستان میں کوئی ایسا آئین نافذ نہیں کیا جائے گا جس کی ملک کے چیدہ اور طاقتور عناصر براہ راست مخالفت کر

رہے ہوں۔ یہ اعلان مسلم لیگ کے نقطہ نظر سے اہم تھا کیونکہ اس میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ اقلیتوں کی مرضی کے خلاف کوئی دستور نافذ نہیں کیا جائے گا۔

کرپس تجاویز 1942ء : جنگ عظیم دوم کے ابتدائی مراحل میں برطانیہ کو ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جاپانی فوج نے برما پر قبضہ کر لیا جس کی وجہ سے برصغیر کو خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس پر حکومت برطانیہ نے اہل ہند کی حمایت حاصل کرنے کے لیے سٹیفورڈ کرپس کو ہندوستان بھیجا جس نے مختلف سیاسی جماعتوں سے تبادلہ خیال کے بعد مندرجہ ذیل سفارشات پیش کیں۔

1۔ جنگ کے خاتمہ پر ایک دستور ساز اسمبلی قائم کی جائے گی جو ہندوستان کے لئے نیا دستور مرتب کرے گی۔
2۔ جنگ کے خاتمہ پر صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوں گے۔ صوبائی اسمبلیوں کے ارکان اپنی تعداد کے دسویں حصے کے برابر دستور ساز اسمبلی کے ارکان کا انتخاب کریں گے۔
3۔ ملک کا آئین وفاقی ہوگا جس میں اقلیتوں کے حقوق کو تحفظ حاصل ہوگا۔
4۔ جنگ کے بعد برصغیر کو آزادی دے دی جائے گی۔
5۔ صوبوں کو اجازت ہوگی کہ وہ یونین سے الگ ہو جائیں۔ علیحدہ ہونے والے صوبے اپنا الگ وفاق بھی بنا سکیں گے۔

تجاویز کا دوسرا حصہ فوری اقدامات کے بارے میں تھا جس میں کہا گیا تھا کہ وائسرائے کی انتظامی کونسل کے تمام ارکان ہندوستانی ہوں گے اور اس میں ملک کی سیاسی جماعتوں کے نمائندے شامل ہوں گے۔ البتہ دفاع کا شعبہ برطانیہ کے پاس رہے گا۔

کانگرس ان تجاویز سے اس لئے ناخوش تھی کہ ان میں صوبوں کو علیحدگی کا اختیار دے کر قیام پاکستان کا امکان پیدا کر دیا گیا تھا۔ مسلم لیگ نے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ ان تجاویز سے پاکستان بننے کا امکان پیدا ہو گیا تھا مگر مطالبہ پاکستان کے براہ راست تسلیم نہ کئے جانے پر وہ بھی ناخوش تھی۔ اس طرح کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے الگ الگ وجوہات کی بناء پر کرپس تجاویز کو مسترد کر دیا۔

"ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک : کانگرس کا خیال تھا کہ چونکہ جنگ میں برطانیہ کی حالت بڑی نازک ہے اس لیے اس پر دباؤ ڈال کر اپنی مرضی منوائی جا سکتی ہے۔ لہٰذا اس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک شروع کی اور مطالبہ کیا کہ برطانیہ اقتدار فوری طور پر ہندوستانیوں کے حوالے کر کے یہاں سے چلا جائے۔ قائد اعظم نے اس تحریک کی سخت مخالفت کی کیونکہ اس سے ہندوؤں کا مقصد انگریزوں سے اقتدار حاصل کر کے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے غلام بنانا تھا۔ آپ نے حکومت برطانیہ سے کہا کہ پہلے ملک کو تقسیم کرو اور بعد میں اسے چھوڑ دو۔ حکومت نے کانگرس کو خلاف قانون جماعت قرار دے کر تحریک کو سختی سے کچل دیا۔

گاندھی جناح مذاکرات 1944ء : قائد اعظم اور گاندھی میں ستمبر 1944ء میں بمبئی کے مقام پر ہندوستان کے مسائل پر گفت و شنید ہوئی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا کیونکہ گاندھی دو قومی نظریہ کو ماننے کے لیے تیار

نہ تھے۔

ویول پلان : 1944ء میں لارڈ ویول ہندوستان کا وائسرائے بن کر آیا۔ اس نے برصغیر کے سیاسی حل کے لیے اپنے منصوبے کا اعلان کیا جس میں کہا گیا کہ وائسرائے کی انتظامی کونسل فوج کے کمانڈر کے علاوہ تمام ہندوستانی اراکین پر مشتمل ہوگی بعد اس میں تمام قومیتوں کو نمائندگی دی جائے گی۔

شملہ کانفرنس 1945ء : ویول پلان پر غور کرنے کے لئے وائسرائے نے جون 1945ء میں ہندوستانی لیڈروں کی شملہ کے مقام پر کانفرنس بلائی جس میں وائسرائے کی کونسل میں پانچ مسلم اراکین شامل کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ کانگرس مسلم نشستوں پر ایک مسلمان نامزد کرنے کا حق مانگتی تھی۔ دوسری طرف وائسرائے بھی ایک سیٹ پر ملک خضر حیات ٹوانہ وزیر اعلیٰ پنجاب کو نامزد کرنا چاہتا تھا۔ قائد اعظم نے اس ملی بھگت کی سخت مخالفت کی اور واضح کیا کہ مسلمانوں کے پانچوں ارکان کی نامزدگی صرف مسلم لیگ ہی کرے گی کیونکہ صرف وہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اس پر یہ کانفرنس ناکام ہوگئی۔

عام انتخابات 46-1945 : شملہ کانفرنس میں اس بات پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا تھا کہ صرف مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے بالآخر یہ فیصلہ عوام پر چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ 46 - 1945ء عام انتخابات منعقد ہوئے جن میں مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی ساری اور صوبائی اسمبلیوں میں مسلمانوں کی نوے فی صد نشستیں جیت لیں گویا انتخابات نے مسلم لیگ کا ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ درست ثابت کر دیا۔ اب کانگرس یا برطانوی حکومت کے لیے قائد اعظم سے بے اعتنائی برتنا ممکن نہ رہا کیونکہ ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ مسلمانوں کے دل کی آواز تھا۔

قرارداد دہلی 1946ء : اپریل 1946ء میں قائد اعظم نے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے تمام مسلم لیگی ارکان کا ایک کنونشن دہلی میں بلایا جس میں قرارداد لاہور میں ترمیم کر دی گئی اور ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ایک آزاد مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا گیا۔ قرارداد دہلی کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ اسے پورے ملک کے منتخب مسلم نمائندوں نے منظور کیا تھا جبکہ قرارداد لاہور ایک جلسہ عام میں منظور ہوئی تھی۔

کابینہ مشن کا منصوبہ 1946ء : 1945ء میں برطانیہ میں لیبر پارٹی کی حکومت برسر اقتدار آئی۔ اس نے مارچ 1946ء میں اپنی کابینہ کے تین ارکان پر مشتمل ایک مشن ہندوستان بھیجا۔ اس مشن نے کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں سے بات چیت کی مگر وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اس پر اس نے 16 مئی 1946ء کو اپنی طرف سے ایک منصوبے کا اعلان کیا جس کے نمایاں پہلو یہ تھے۔

1۔ برصغیر کی یونین قائم کی جائے گی جو امور خارجہ، دفاع اور رسل و رسائل کی ذمہ دار ہوگی۔
2۔ مذکورہ بالا شعبوں کے علاوہ باقی تمام محکمے صوبوں کے سپرد ہوں گے۔
3۔ ہندوستان کے صوبے مندرجہ ذیل تین گروپوں میں منقسم ہوں گے۔

(i) مدراس، بمبئی، یو۔پی، سی۔پی، بہار، اڑیسہ۔
(ii) پنجاب، سرحد، بلوچستان
(iii) بنگال، آسام

4۔ صوبوں کو باہم گروپ بنانے کا اختیار ہوگا اور ہر گروپ اپنا دستور مرتب کر سکے گا۔
5۔ ہر دس سال بعد صوبے کثرت رائے سے آئین میں تبدیلی کا مطالبہ کر سکیں گے۔

کابینہ مشن نے واضح کیا کہ عبوری اسکیم ایک وحدت ہے اسے کلی طور پر منظور یا مسترد کیا جائے۔ انگریزوں کو یقین تھا کہ کانگرس اسے قبول کرلے گی اور مسلم لیگ اسے مسترد کردے گی کیونکہ اس میں واضح طور پر مطالبہ پاکستان کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا لیکن ان کی توقع کے برعکس کانگرس نے اسے مسترد کردیا اور مسلم لیگ نے اسے قبول کرلیا۔

عبوری حکومت کا قیام : کابینہ مشن کے اعلان کے ساتھ ہی وائسرائے نے واضح کیا کہ جو جماعت اسے منظور کرے گی اس کے تعاون سے عبوری حکومت قائم کردی جائے گی۔ لہٰذا اسے مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی دعوت دینی چاہیے تھی لیکن وہ اپنے وعدے سے پھر گیا۔

یوم راست اقدام : اس وعدہ خلافی پر 27 جولائی 1946ء کو مسلم لیگ نے کابینہ مشن کے منصوبے کی منظوری واپس لے لی اور 16 اگست کو پاکستان کے حصول کے لیے یوم راست اقدام منانے کا فیصلہ کیا لیکن اسی دوران پنڈت نہرو نے وائسرائے کی حکومت بنانے کی دعوت کو قبول کرلیا۔ حکومت کی اس بے انصافی اور جانبدارانہ رویہ کی وجہ سے مسلمانوں میں غم و غصہ کی شدید لہر دوڑ گئی اور 16 اگست 1946ء کو یوم راست اقدام کے موقع پر صرف کلکتہ میں فسادات کے دوران سینکڑوں افراد مارے گئے۔ اس تباہی کا منظر دیکھنے کے بعد وائسرائے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے قائداعظم کو حکومت میں شمولیت کی دعوت دی۔

پہلا قومی بجٹ : 26 اکتوبر 1946ء کو مسلم لیگ کے پانچ ارکان نے کابینہ میں شمولیت اختیار کی۔ لیاقت علی خان کو خزانہ کا محکمہ دیا گیا۔ انہوں نے فروری 1947ء میں سالانہ بجٹ پیش کیا جسے غریب آدمی کا بجٹ کہا گیا اس میں سرمایہ داروں کے مفادات پر زد پڑتی تھی جو کہ ہندو تھے۔ اب ہندوؤں کو احساس ہوا کہ انہوں نے مالیات کا محکمہ مسلمانوں کے سپرد کرکے سخت غلطی کی تھی۔ ہندو سرمایہ داروں نے کانگری لیڈروں پر واضح کردیا کہ آئندہ بھی ساجی بہبود کے نام پر غریب مسلم عوام ہندوؤں کی دولت سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے اس لیے ملک کی تقسیم پر رضامند ہوجانا چاہیے۔

تین جون کا منصوبہ : عبوری حکومت میں شدید اختلافات کی وجہ سے ملک میں خانہ جنگی کے آثار پیدا ہوگئے۔ ان حالات میں وزیراعظم نے اعلان کیا کہ برطانیہ بہرحال جون 1948ء تک اقتدار اہل ہند کو منتقل کر دے گا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ماؤنٹ بیٹن کو لارڈ ویول کی جگہ ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن مارچ 1947ء میں ہندوستان آیا۔ اس کے پنڈت نہرو اور کانگرس کے دوسرے لیڈروں کے ساتھ ذاتی مراسم تھے اس لئے شروع ہی سے اس کا رویہ کانگرس کے حق میں دوستانہ تھا لیکن وہ ہندو اور مسلمان لیڈروں سے بات چیت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ ملک کی تقسیم کے بغیر کوئی چارہ نہیں لہٰذا اس نے مختلف سیاسی رہنماؤں سے گفت و شنید کے بعد آزادی ہند کے بارے میں ایک منصوبہ بنایا جس کا اعلان 3 جون 1947ء کو کیا گیا۔ اس کے اہم نکات حسب ذیل تھے۔

1۔ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کردیا جائے گا۔
2۔ پنجاب اور بنگال کی اسمبلیوں کے مسلم اکثریت کے اضلاع کے ممبران الگ الگ کثرت رائے سے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بارے میں رائے دیں گے۔
3۔ اگر پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فیصلہ ہوا تو سرحدوں کے تعین کے لئے حد بندی کمیشن مقرر کئے جائیں گے۔
4۔ سندھ اسمبلی کے ارکان کثرت رائے سے صوبے کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔
5۔ صوبہ سرحد کا فیصلہ استصواب رائے سے کیا جائے گا۔
6۔ بلوچستان کے شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپلٹی کے غیر سرکاری اراکین کو بھی حق دیا جائے گا کہ وہ پاکستان یا بھارت کے ساتھ شمولیت کا فیصلہ کریں۔
7۔ صوبہ آسام کے ضلع سلہٹ کے مستقبل کا فیصلہ بھی استصواب رائے سے ہوگا۔
8۔ ریاستیں کابینہ مشن کے منصوبے کے مطابق اپنے مخصوص حالات اور جغرافیائی حیثیت کی روشنی میں کسی ایک مملکت میں شمولیت کا فیصلہ کریں گی۔
9۔ حکومت برطانیہ 1948ء سے قبل اقتدار ہندوستانیوں کو منتقل کردے گی۔

4 جون 1947ء کو ماؤنٹ بیٹن نے اعلان کیا کہ انتقال اقتدار کے لئے 15 اگست کی تاریخ مقرر کر دی گئی ہے۔

قانون آزادی ہند : 18 جولائی 1947ء کو برطانوی پارلیمنٹ نے تقسیم ہند کے منصوبے کو آزادی ہند کے نام سے پاس کیا جس کی رو سے ہندوستان کو دو خودمختار ریاستوں میں تقسیم کردیا گیا۔ یہ اعلان کیا گیا کہ 15 اگست 1947ء کو برصغیر پر برطانوی اقتدار ختم ہوجائے گا۔ قانون آزادی ہند کی اہم دفعات درج ذیل ہیں۔

1۔ ہندوستان کو دو آزاد ریاستوں میں تقسیم کردیا جائے گا۔
2۔ ان دونوں ریاستوں پر برطانوی حکومت کی عملداری مکمل طور پر ختم ہوجائے گی اور دونوں ممالک کے قانون ساز ادارے اپنے اپنے ملک میں قانون سازی کے مکمل طور پر مجاز ہونگے۔
3۔ دونوں ممالک اپنا آئین بننے تک اپنے اپنے ممالک کا نظام حکومت 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت چلائیں گے اور وہ 1935ء کے ایکٹ میں قانون آزادی ہند کی روشنی میں ضروری ترامیم کے مجاز ہونگے۔

4۔ 31 مارچ 1948ء تک دونوں ممالک کے گورنر جنرلوں کو اپنے اپنے ملک میں ضروری ترامیم کا اختیار ہوگا اور بعد ازاں دونوں ممالک کی مجالس قانون ساز کو اسے جاری رکھنے یا اس میں ترامیم کا اختیار ہوگا۔

5۔ تاج برطانیہ کو بھارت اور پاکستان کی مجالس قانون ساز کیطرف سے پاس کردہ قوانین کو مسترد کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہوگا بلکہ یہ اختیار صرف متعلقہ گورنر جنرل کو حاصل ہوگا۔

6۔ حکومت برطانیہ اور شاہی ریاستوں کے حکمرانوں کے درمیان کئے جانے والے تمام معاہدات منسوخ ہو جائیں گے اور شاہی ریاستیں متعلقہ مملکت سے اپنے تعلقات گفت و شنید سے طے کریں گی۔

7۔ برطانوی بادشاہ کے خطابات سے شہنشاہ ہند کا خطاب ختم کر دیا گیا۔ قانون آزادی ہند کے تحت قائداعظم محمد علی جناح کو پاکستان کا پہلا گورنر جنرل بنایا گیا۔

ریڈکلف ایوارڈ

3 جون 1947ء کے منصوبے کے تحت پنجاب اور بنگال کی اسمبلیوں نے صوبوں کی تقسیم کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس لیے ان صوبوں کی ازسرنو حد بندی ضروری ہو گئی تھی۔

دونوں ملکوں کے درمیان حد بندی کا کام بہت اہم اور نازک تھا اس لیے قائداعظم نے تجویز پیش کی کہ یہ ذمہ داری اقوام متحدہ کے سپرد کی جائے لیکن کانگرس نے اسے منظور نہ کیا۔ اب قائداعظم پریوی کونسل کے تین ججوں کے ذریعے یہ کام کروانا چاہتے تھے لیکن ماؤنٹ بیٹن نے یہ عذر پیش کیا کہ وہ برصغیر کی گرمی برداشت نہ کر سکیں گے۔ اس پر برطانوی حکومت نے ایک وکیل سرل ریڈکلف کو حد بندی کمیشن کا چیئرمین مقرر کیا۔ جو 8 جولائی کو ہندوستان پہنچا۔

پنجاب اور بنگال کی حد بندی کے لیے الگ الگ باؤنڈری کمیشن مقرر کئے گئے جن میں پاکستان اور ہندوستان کے دو دو نمائندے شامل تھے۔ ریڈکلف خود کسی کمیشن کے اجلاس میں شریک نہیں ہوتا تھا۔ ہندو اور مسلمان جج فریقین کے دلائل سننے کے بعد اپنا اپنا فیصلہ لکھتے۔ ان فیصلوں کو پڑھ کر چیئرمین اپنا ثالثی فیصلہ لکھتا۔ فریقین اس فیصلے کو قبول کرنے کے پابند تھے۔ ریڈکلف ایوارڈ کا اعلان 17 اگست 1947ء کو کیا گیا جس میں پاکستان کے ساتھ مندرجہ ذیل ناانصافیاں کی گئیں۔

ا۔ کلکتہ میں مسلم لیگ نے رائے شماری کرانے کا مطالبہ کیا تھا کیونکہ اس میں آبادی کی اکثریت ہندو اچھوتوں کی تھی اور ان کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ تھیں۔ اس مطالبے کو رد کر کے کلکتہ کا شہر اور بندرگاہ
• ہندوستان کے حوالے کر دیئے گئے۔

۲۔ بنگال میں مرشد آباد اور ندیہ کے مسلم اکثریت کے علاقے ہندوستان سے ملحق کر دیئے گئے۔

۳۔ پنجاب میں مسلم اکثریت کی تحصیلیں گورداسپور، بٹالہ، فیروزپور اور زیرہ بھارت میں شامل کر دی گئیں۔

ریڈکلف نے حد بندی کا اعلان انصاف کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر کیا۔ دراصل ریڈکلف ایوارڈ انصاف پر مبنی ایک قانونی فیصلہ نہیں تھا۔ بلکہ ایک سیاسی اور جانبدارانہ فیصلہ تھا۔

پاکستان کو انتہائی اہم علاقوں سے محروم کر کے اس کے لیے آغاز ہی میں متعدد مسائل پیدا کر دیئے گئے۔ ایک گہری سازش کے تحت گورداسپور کا علاقہ بھارت کو دے دیا گیا۔ کیونکہ ریاست جموں و کشمیر کو راستہ اسی تحصیل سے گزرتا تھا۔ اس طرح کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ قبضہ کی راہ ہموار ہو گئی اور کشمیر کا تنازعہ پیدا ہو گیا۔ دریائے راوی پر مادھوپور اور دریائے ستلج پر فیروزپور کے ہیڈورکس ہندوستان کو دے دیئے۔

اس طرح مغربی پنجاب کو سیراب کرنیوالی نہروں کے ہیڈورکس بھارت کے پاس چلے گئے۔ اور دونوں ملکوں کے درمیان نہری پانی کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔

حد بندی کمشن کے ایک رکن جسٹس محمد منیر کے مطابق ریڈکلف نے فیروزپور، زیرہ اور فاضل کا تحصیل کا کچھ حصہ اور فیروزپور ہیڈورکس پاکستان میں شامل کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا تھا اور یہ فیصلے ۸ اگست کو ہو چکے تھے۔ مگر ۸ اگست اور ۱۷ اگست کے درمیان ان فیصلوں میں تبدیلی کر دی گئی۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ سب کچھ ماؤنٹ بیٹن اور کانگرس کے درمیان خفیہ سمجھوتے کی بنا پر ہوا۔ ریڈکلف محض ایک آلۂ کار تھا۔ دراصل کانگرس نے ملک کی تقسیم اور دولت مشترکہ میں شمولیت ان شرائط پر قبول کی تھی۔

ا۔ انتقال اقتدار دو ماہ کے اندر ہو جائے۔

۲۔ کلکتہ کو بھارت میں شامل کیا جائے۔

۳۔ گورداسپور اور بٹالہ کی تحصیلیں بھارت کا حصہ قرار دی جائیں۔

ریڈکلف ایوارڈ پر تبصرہ کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا۔ "یہ ایوارڈ غیر منصفانہ، ناقابل فہم بلکہ غیر معقول ہے۔ لیکن چونکہ میں اس پر عمل کرنے کا عہد کر چکا ہوں۔ اس لیے اسکی پابندی ہم پر لازم ہے۔"

پاکستان کے ابتدائی مسائل

پاکستان بننے کے بعد اس ملک کو بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان میں سے کچھ مسائل تو ایسے تھے جو ایک نئے ملک کو لازماً پیش آتے ہیں۔ لیکن اکثر مصائب بھارت کے پیدا کردہ تھے۔ بھارت کے لیڈروں نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت آغاز میں ہی پاکستان کے لیے مشکلات کھڑی کر دیں۔ تاکہ یہ ملک اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکے۔ لیکن پاکستانیوں نے بے پناہ جوش و خروش اور جذبہ ایثار و قربانی کی بدولت دنیا کو یہ دکھا دیا کہ پاکستان ختم ہونے کے لیے نہیں بلکہ قائم رہنے کے لیے وجود میں آیا ہے۔

تقسیم ملک میں جلد بازی: فروری ۱۹۴۷ء میں برطانوی وزیراعظم لارڈ ایٹلی نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت جون ۱۹۴۸ء تک برصغیر کے باشندوں کو اقتدار منتقل کردے گی۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ ابھی یہ طے کرنا باقی ہے کہ اقتدار کس کے حوالے کیا جائے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا نیا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ جس نے برصغیر کے سیاسی لیڈروں سے گفت و شنید کرنے کے بعد ۳ جون ۱۹۴۷ء میں اعلان کیا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک ملک کو آزاد کردیا جائے گا۔ اگر انتقال اقتدار جون ۱۹۴۸ء میں ہوتا تو دونوں حکومتوں کو اثاثوں میں اور دیگر ساز و سامان کی تقسیم کے لئے کافی وقت مل جاتا۔ ہندوؤں کو تمام ادارے اور دفاتر قائم شدہ حالت میں ملے مگر دو ماہ کے قلیل عرصہ میں پاکستان کے راہنماؤں کے لیے تقسیم سے پیدا ہونے والے مسائل کا اندازہ لگانا اور ان کو سلجھانا ناممکن تھا۔

پاکستان کو دل سے تسلیم نہ کرنا: پاکستان ہندو لیڈروں کی مرضی کے خلاف معرض وجود میں آیا تھا۔ وہ ملک کی تقسیم پر مجبوراً رضامند ہوئے تھے۔ اس لیے انہوں نے پاکستان کو کبھی دل سے تسلیم نہ کیا اور ہمیشہ اسے ختم کرنے کی سازشوں میں مصروف رہے۔ پنڈت نہرو نے ایک موقع پر کہا:

> "یہ تقسیم عارضی ہے اور ہندوستان ایک دفعہ پھر متحد ہو کر رہے گا۔ جناح کو پاکستان لینے دو۔ لیکن اقتصادی حربوں اور دوسرے طریقوں سے اتنی مشکلات پیدا کر دی جائیں گی کہ بالآخر پاکستان گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گا اور دوبارہ ہندوستان میں شمولیت کی درخواست کرے گا۔"

حد بندی کمیشن کی بد دیانتی: قانون آزادی ہند کی رو سے پنجاب اور بنگال کے صوبوں کو مسلم اور ہندو اکثریت کے علاقوں میں تقسیم کیا جانا تھا۔ اس مقصد کے لیے باؤنڈری کمیشن مقرر کئے گئے جن کا چیئرمین ریڈ کلف تھا۔ اس نے انتہائی بد دیانتی سے کام لیتے ہوئے بنگال میں مرشد آباد اور ندیا کے مسلم اکثریتی علاقے اور مغربی پنجاب میں ضلع گورداسپور اور اجنالہ، زیرہ اور فیروزپور کی تحصیلیں ہندوستان میں شامل کر دیں۔ اس ناقص حد بندی کی وجہ سے پاکستان کو نہری پانی اور کشمیر جیسے سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

مہاجرین کی آمد: قیام پاکستان کے بعد سب سے سنگین اور فوری توجہ طلب مسئلہ مہاجرین کی آمد تھی۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوؤں اور سکھوں نے باقاعدہ سکیم کے تحت پورے بھارت اور بالخصوص مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم کو یقین دلایا تھا کہ مسلمانوں کی خونریزی روکنے کے لیے سکھ لیڈروں کو گرفتار کرے گا۔ لیکن اس نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے ایسا نہ کیا جس کے نتیجے میں سکھوں نے مشرقی

پنجاب میں انگریزوں اور ہندوؤں کی شہہ پر بے گناہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ عورتیں اور بچے ان کی درندگی اور ظلم و ستم کا خاص طور پر نشانہ بنے۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۹۴۸ء تک سوا کروڑ مہاجرین پاکستان میں داخل ہوئے۔ دنیا کی تاریخ میں کبھی بھی کسی قوم کے لوگوں کا کسی ملک سے اتنی تعداد میں اخراج نہیں ہوا۔

ایک نئی سلطنت کے لیے اتنے زیادہ مہاجرین کی آباد کاری جن کے پاس تن کے لباس کے سوا کچھ نہ تھا بہت اہم مسئلہ تھا۔ ان کی اکثریت کو مغربی پنجاب کی نہری زمینوں پر آباد کیا گیا اور وقتی طور پر ہر کاشتکار کو آٹھ ایکڑ زمین دی گئی۔ بالآخر ایوب خان کے دور حکومت میں مہاجرین کی جائیدادوں کے دعوؤں کا فیصلہ ہوا۔

انتظامی مسائل: آغاز میں پاکستان کو انتظامی لحاظ سے بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ غیر منقسم ہندوستان میں بیشتر سرکاری افسر ہندو تھے جن کے پاکستان سے چلے جانے کی وجہ سے انتظامی مشینری کمزور ہو گئی۔ اس وقت تجربہ کار مسلمان افسر بہت قلیل تعداد میں تھے جس کی وجہ سے مجبوراً کئی انگریز افسروں کی خدمات حاصل کرنا پڑیں۔

دفاتر اور متعلقہ سامان کی قلت: کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت بنایا گیا لیکن اس شہر میں دفاتر کے لیے مناسب سرکاری عمارات نہ تھیں جس کے سبب کئی دفاتر بارکوں میں قائم کئے گئے۔ ہندوستان نے پاکستان کے حصے کا سرکاری دفاتر کا فرنیچر اور دیگر سامان بھی روک لیا۔ بعض ریل گاڑیوں پر جن میں پاکستان کے حصے کا ضروری دفتری سامان اور سرکاری ملازم پاکستان آ رہے تھے حملے کرکے سرکاری ریکارڈ تلف کر دیا اور ملازمین اور مہاجرین کو قتل کیا گیا چنانچہ شروع میں دفتروں میں میز، کرسی، کاغذ اور ٹائپ مشینوں کی شدید کمی کا سامنا تھا۔

اثاثوں کی تقسیم: متحدہ ہندوستان کے پاس چار ارب کا محفوظ سرمایہ تھا جس میں سے پاکستان ایک چوتھائی یعنی ایک ارب روپے کا دعویدار تھا۔ لیکن بھارت کی حکومت صرف پانچ فی صد یعنی بیس کروڑ دینے پر رضامند تھی۔ اس کے برعکس قرضہ جات کا ۲۰ فیصد پاکستان کے کھاتے میں ڈالا جا رہا تھا۔ اس مسئلہ پر دونوں ملکوں کے نمائندوں کے درمیان دہلی میں ملاقات ہوئی اور طے پایا کہ نقد اثاثہ جات میں سے پاکستان کو بیس فی صد یعنی پچھتر کروڑ ملے گا جبکہ قرضہ جات کی ذمہ داری ساڑھے سترہ فی صد ہو گی۔ معاہدہ کے باوجود بھارت نے بیس کروڑ روپے ادا کر کے باقی رقم اس بہانے روک لی کہ پاکستان یہ وسائل کشمیر کی جنگ میں استعمال کرے گا۔ بالآخر گاندھی نے روپے کی ادائیگی کے لیے بھارت پر دباؤ ڈالنے کے لیے مرن بھرت رکھا جس پر مجبوراً باقی رقم پاکستان کو دے دی گئی۔ لیکن چند روز بعد ایک انتہا پسند ہندو نے اس ہمدردی کے عوض گاندھی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

فوجی وسائل کی تقسیم: تقسیم ہند کے وقت فوج اور فوجی اثاثوں کی تقسیم کا مسئلہ بہت حساس اور نازک تھا۔ انگریز کمانڈر انچیف اور ہندو لیڈر فوج کی تقسیم کے

خلاف تھے۔ لیکن قائداعظم کے اصرار پر بالآخر ایک سات رکنی کمیٹی بنائی گئی جس کا سربراہ کمانڈر انچیف آکن لیک تھا جس کے ذمے تقسیم افواج کا کام یکم اپریل ۱۹۴۸ء تک مکمل کرنا تھا معاہدہ کے مطابق متحدہ ہندوستان کے فوجی اثاثوں کا ایک تہائی پاکستان کو ملنا تھا مگر صورت حال یہ تھی کہ تمام اسلحہ ساز فیکٹریاں اور اسلحہ کے ڈپو بھارتی علاقے میں تھے۔ اسی طرح مسلم اکثریت کے فوجی یونٹ یا تو ملک سے باہر متعین تھے یا دور دراز علاقوں میں تھے۔ جس کی وجہ سے وہ فوراً پاکستان منتقل نہ ہو سکے۔ بھارت نے اسلحہ ساز فیکٹریوں کی مشینری پاکستان بھیجنے سے انکار کر دیا اور فوجی اثاثوں کی تقسیم میں اتنی رکاوٹیں پیدا کیں کہ تنگ آکر کمانڈر انچیف آکن لیک نے استعفیٰ دے دیا اور برطانوی حکومت کو لکھا کہ "نہرو حکومت یہ پختہ ارادہ کر چکی ہے کہ جہاں تک ہو سکے وہ پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر قائم نہیں ہونے دے گی"

بھارتی حکومت نے آخر کار فوجی دفاتر میں سے بڑے سائز کے جوتے، پھٹی پرانی وردیاں اور ناکارہ سامان پاکستان بھیجا۔

نہری پانی کا تنازعہ: پنجاب کی غیر منصفانہ اور غلط حد بندی کر کے ریڈ کلف نے دریائے راوی پر مادھو پور کا ہیڈ ورکس اور دریائے ستلج پر فیروز والا کا ہیڈ ورکس بھارت کو دے دیئے جبکہ یہاں سے نکلنے والی نہریں پاکستان کے علاقے کو سیراب کرتی تھیں۔ یکم اپریل ۱۹۴۸ء کو بھارت نے پیشگی اطلاع کے بغیر ان نہروں کا پانی بند کر دیا اور پاکستان کی زراعت کو تباہ کرنے کی کوشش کی۔ اپنی اشد ضرورت کے تحت پاکستان ہندوستان کو نہری پانی کا معاوضہ دینے پر مجبور ہو گیا پاکستان نے اس مسئلہ کو اقوام متحدہ کے سامنے پیش کیا۔ آخر کار عالمی بنک کی وساطت سے ۱۹۶۰ء میں سندھ طاس معاہدہ کی رو سے یہ جھگڑا طے ہوا۔ اس معاہدہ کی بدولت تین مشرقی دریاؤں ستلج، بیاس اور راوی بھارت کو مل گئے اور تین مغربی دریا چناب جہلم اور سندھ پاکستان کے حصے میں آئے۔ مشرقی علاقوں میں پانی کی کمی کو دور کرنے کے لیے پاکستان میں منگلا ڈیم اور تربیلا ڈیم کے علاوہ آٹھ رابطہ نہروں کا سلسلہ تعمیر کیا گیا۔

مسئلہ کشمیر: جموں و کشمیر کی ریاست پاکستان سے ملحق تھی اور یہاں کی ۸۰ فی صد آبادی مسلمان تھی لیکن ریاست کا حکمران ہری سنگھ ہندو تھا۔ ریڈ کلف نے بے ایمانی سے کام لے کر ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کے کہنے پر گورداسپور کا علاقہ بھارت کو دے دیا۔ اس طرح بھارت کو کشمیر تک پہنچنے کا راستہ مل گیا اور بالآخر اس نے ہری سنگھ سے مل کر اپنی فوجیں کشمیر میں داخل کر کے ریاست پر قبضہ کر لیا۔ اس پر دونوں ملکوں میں جنگ چھڑ گئی۔ ادارہ اقوام متحدہ کی مداخلت پر لڑائی بند ہوئی۔ اور بھارتی حکومت نے کشمیر میں رائے شماری کرانے کا وعدہ کیا۔ لیکن بعد میں اس عہد سے پھر گیا۔ کشمیر کے مسئلہ پر پاکستان اور بھارت میں کئی بار جنگ کی نوبت آئی۔ اور تاحال یہ جھگڑا طے نہیں ہو سکا۔

معاشی مسائل: قیام پاکستان سے پہلے معاشی زندگی کے ہر شعبہ پر ہندوؤں کا غلبہ تھا۔ صنعت و تجارت اور بنکاری پر غیر مسلم چھائے ہوئے تھے انہوں نے تقسیم سے پہلے ہی اپنا سرمایہ بھارت منتقل کر دیا۔ ہندوؤں کے ترک وطن کر جانے کی وجہ سے ملکی معیشت کا ہر شعبہ متاثر ہوا۔

دستوری مسائل: قیام پاکستان کے بعد اس ملک کو ایسے آئین کی ضرورت تھی جو اس کی آزادی اور خود مختاری کا ضامن اور اسلامی معاشرہ کے قیام میں معاون ہو۔ وقتی طور پر ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں ضروری ترامیم کر کے اس کو پاکستان کے عبوری دستور کے طور پر اختیار کیا گیا۔ دیگر فوری حل طلب مسائل کی موجودگی میں آئین سازی کے معاملے میں تاخیر ہوتی گئی جس کی وجہ سے بعد میں کئی مشکلات پیدا ہوئیں۔

پختونستان کا شوشہ: سرحدی گاندھی عبدالغفار خان سرحد کے عوام کو بھارت کے ساتھ الحاق پر آمادہ نہیں کر سکے تھے۔ اس لیے انہوں نے اس رائے شماری کا بائیکاٹ کیا جس میں صوبہ سرحد کے عوام سے پاکستان میں شامل ہونے کے متعلق رائے لی گئی تھی۔ اپنے ارادوں میں ناکامی کے بعد انہوں نے آزاد پختونستان کا شوشہ چھوڑ دیا۔ اس ضمن میں انہیں ہمیشہ بھارت اور افغانستان کی مالی اور اخلاقی امداد حاصل رہی۔ اور انہوں نے اپنے آقاؤں کی شہ پر پاکستان کے لیے مشکلات پیدا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

ریاستوں کے الحاق کے مسائل: قانون آزادی ہند کی رو سے ہندوستان کی خود مختار ریاستوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ دونوں ممالک میں سے جس کے ساتھ چاہیں الحاق کر لیں۔ اور ایسا کرتے وقت اپنی جغرافیائی حیثیت اور رعایا کی خواہش کا خیال رکھیں۔ چنانچہ بہاولپور، لس بیلہ، مکران اور قلات کی ریاستیں پاکستان میں شامل ہو گئیں۔ ان کے علاوہ جوناگڑھ، مناودر اور منگرول کی ریاستوں نے بھی پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کیا۔ مگر بھارت نے ان ریاستوں میں ہندوؤں کی اکثریت کو جواز بنا کر طاقت کے ذریعے قبضہ کر لیا۔ لیکن کشمیر میں اس نے یہ اصول تسلیم نہ کیا حالانکہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور اس کی سرحدیں بھی پاکستان سے ملتی تھیں۔

"مسئلہ کشمیر"

تقسیم ہند کے وقت جموں اور کشمیر کی ریاست ملک کی اہم ترین ریاستوں میں سے ایک تھی۔ اس کا پہلا مسلمان حکمران سلطان سکندر بت شکن تھا جس نے ۱۳۹۴ء میں اس پر قبضہ کیا۔ اس ریاست کو ۱۸۴۶ء میں معاہدہ لاہور کی رو سے ۷۵ لاکھ روپے کے عوض انگریزوں نے گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ اس وقت سے اس پر ڈوگرہ خاندان حکمران تھا۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی کل آبادی چالیس لاکھ تھی۔ کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی ۹۶ فیصد اور جموں میں ۷۰ فی صد تھی۔ کشمیر کی سرحدیں ہندوستان کے علاوہ، چین، روس اور افغانستان سے ملتی تھیں اس طرح اس کو بین الاقوامی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔

قانون آزادی ہند کی رو سے برصغیر کی ریاستوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ بھارت اور پاکستان میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کر لیں اور ایسا کرتے وقت اپنے جغرافیائی محل وقوع اور عوام کی رائے کا خیال رکھیں۔ اس اصول کو مد نظر رکھا جاتا تو مندرجہ ذیل اسباب کے بنا پر کشمیر کو لازماً پاکستان میں شامل ہونا چاہیے تھا۔

۱۔ کشمیر جغرافیائی لحاظ سے پاکستان سے ملحق ہے کیونکہ اس کی تقریباً سات سو کلو میٹر لمبی سرحد پاکستان کے ساتھ ملتی ہے۔

۲۔ مذہبی، معاشرتی اور معاشی نکتہ نظر سے بھی کشمیر پاکستان سے زیادہ منسلک ہے۔ اس کی اکثریتی آبادی مسلمان ہے۔ علاوہ ازیں نسلی، تہذیب و تمدن اور رسوم و رواج کے لحاظ سے بھی کشمیری پاکستان کے مسلمانوں کے بہت قریب ہیں۔

۳۔ اقتصادی لحاظ سے کشمیر کا پاکستان سے گہرا تعلق ہے۔ کشمیر سے لکڑی کاٹ کر دریاؤں کے ذریعے پہلے پنجاب آتی تھی اور پھر دوسرے علاقوں میں سپلائی کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ کشمیر سے کھالیں اور اون پنجاب اور سندھ میں لاکر فروخت کی جاتی تھیں۔ کشمیر کے لوگ روزگار کی تلاش میں بھی پاکستان کے علاقے میں آتے تھے۔

۴۔ پاکستان کے تمام دریا کشمیر سے نکلتے ہیں۔ اس طرح پاکستان کی زرعی معیشت کے لیے کشمیر شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۵۔ ۱۹۴۷ء تک کشمیر کو بیرونی دنیا سے ملانے والے تینوں راستے (ا) سری نگر جموں، سیالکوٹ (اا) سری نگر، ایبٹ آباد (ااا) سری نگر، راولپنڈی پاکستان آتے تھے۔ ان تین راستوں کے علاوہ کشمیر کا بذریعہ سڑک برصغیر کے کسی علاقہ سے رابطہ نہ تھا۔

۶۔ پاکستان کے موثر دفاع کے لیے کشمیر کا الحاق اس ملک سے بہت ضروری تھا۔

۷۔ کشمیر کو ہمیشہ پاکستان کا ہی حصہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ چوہدری رحمت کے مجوزہ لفظ پاکستان میں کشمیر کی نمائندگی "ک" سے کی گئی تھی۔

انہی وجوہات کی بنا پر قائداعظم نے بجا طور پر فرمایا تھا کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے اور کوئی شخص شہ رگ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن مندرجہ بالا اسباب کے باوجود کانگریسی لیڈر ہر قیمت پر کشمیر کو ہندوستان میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ کشمیر کی جنت نظیر وادی اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتی تھی۔ پنڈت نہرو کا تعلق بھی کشمیری خاندان سے تھا۔ چنانچہ وہ اس حسین و جمیل خطے سے ذاتی تعلق اور پاکستان کو نقصان پہنچانے کے غرض سے کشمیر پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ بھارت عبدالغفار خان کے ذریعے صوبہ سرحد کو پاکستان میں شامل ہونے سے روکنا چاہتا تھا۔ اور صوبہ سرحد کا بھارت کے ساتھ رابطہ صرف کشمیر کے ذریعے ہی ممکن تھا۔ چنانچہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان کے بعد کانگرس کے صدر راچاریہ کرپلانی نے اور اس کے بعد گاندھی اور ماؤنٹ بیٹن نے بھی کشمیر کے دورے کئے اور مہاراجہ پر بھارت سے الحاق کرنے پر دباؤ ڈالا۔

ریاست جموں و کشمیر کا راجہ ہری سنگھ ڈوگرہ ہندو تھا اور اس نے مسلمانوں پر بے پناہ ظلم و ستم روا رکھا تھا۔ چنانچہ اس کے مظالم سے تنگ آکر ۱۹۳۱ء میں کشمیری مسلمان بغاوت کر چکے تھے۔ جس کے دوران ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو ۳۱ آدمیوں کو سری نگر کی جیل کے سامنے قتل کر دیا گیا۔ کشمیری ہر سال اس دن کو "یوم شہدا" کے طور پر مناتے ہیں۔ آخر کار انگریز حکومت کی مدد سے اس بغاوت کو سختی سے کچل دیا گیا۔

اعلان آزادی کے بعد جب مسلم آبادی کی طرف سے پاکستان کے ساتھ الحاق کا مطالبہ زور پکڑتا گیا تو مہاراجہ نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پنجاب اور صوبہ سرحد سے ملنے والے پونچھ اور جموں کے علاقوں کے مسلمانوں سے ہتھیار جمع کرالئے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شیخ عبداللہ کو قید سے رہا کر دیا کیونکہ وہ کشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق کا حامی تھا۔ اس کے برعکس پاکستان کی حامی جماعت مسلم کانفرنس کے قائد چوہدری غلام عباس کو بدستور جیل میں رکھا گیا۔

سازش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف نے انتہائی بددیانتی سے کام لیتے ہوئے گورداسپور کا علاقہ بھارت میں شامل کر دیا۔ اس طرح بھارت کو کٹھوعہ کے راستے جموں تک پہنچنے کے لیے راستہ مل گیا۔ جس کے بعد ڈوگرہ حکمران نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی تیاریاں شروع کر دیں۔

عوامی بغاوت

مہاراجہ کشمیر نے بظاہر عوام کو مطمئن کرنے کے لیے پاکستان کے ساتھ معاملات کو جوں کا توں رکھنے (StANDSTILL AGREEMENT) کا ایک معاہدہ کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پٹیالہ اور کپور تھلہ کی ریاستوں اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے ایجنٹوں کی مدد سے ریاست میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں پانچ لاکھ مسلمان مارے گئے۔ تقریباً پانچ لاکھ ہجرت کر کے پاکستان پہنچ گئے ان حالات میں پونچھ کے علاقے میں بغاوت پھیل گئی جس نے بعد میں تحریک آزادی کشمیر کی صورت اختیار کر لی۔ کشمیریوں کی مدد کے لیے قبائلی مجاہدین بھی ریاست میں پہنچ گئے اور کشمیر کا کافی حصہ آزاد کرا لیا۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو سردار محمد ابراہیم کی قیادت میں آزاد کشمیر حکومت کے قیام کا اعلان کیا گیا جس کا صدر مقام پلندری تھا۔ صورت حال کو اپنے خلاف جاتا دیکھ کر مہاراجہ کشمیر نے بھارت کے ساتھ الحاق کی دستاویز پر دستخط کر دیے اور ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو بھارتی فوجیں سری نگر پہنچ گئیں۔

ان حالات میں پاکستانی افواج نے بھی جوابی کاروائی شروع کر دی۔ اور پیش قدمی کرتے ہوئے سری نگر کے قریب پہنچ گئیں۔ جنگ میں بھارت کو اپنی پوزیشن خطرے میں نظر آئی چنانچہ اس نے یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو مسئلہ کشمیر ادارہ اقوام متحدہ میں پیش کر دیا۔ سلامتی کونسل نے ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ مئی ۱۹۴۹ء کو دو قرار دادیں پاس کیں جن کا خلاصہ یہ تھا۔

۱۔ جنگ فوری طور پر بند کر دی جائے اور اقوام متحدہ کے کمشن کی نگرانی میں آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کے درمیان جنگ بندی کی لائن کھینچ دی جائے۔

۲۔ دونوں حکومتیں کشمیر سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔

۳۔ اقوام متحدہ کی نگرانی میں استصواب رائے کا انتظام کیا جائے سلامتی کونسل کی قرار دادوں کے مطابق کشمیر میں جنگ بندی ہو گئی۔ اس وقت تک ریاست کے ۳۲% حصہ آزاد ہو چکا تھا اور اس پر آزاد جموں و کشمیر کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۳ء تک اقوام متحدہ کی طرف سے کئی نمائندے بھیجے گئے تاکہ کشمیر میں استصواب رائے کا انتظام کیا جائے۔ لیکن بھارت مختلف حیلوں بہانوں سے رائے شماری کو ٹالتا رہا۔ ۱۹۵۴ء میں ہندوستان نے کشمیر میں اپنی فوجوں کی نگرانی میں انتخابات کرا کے ایک نام نہاد اسمبلی بنائی۔ جس نے ریاست کے ہندوستان سے الحاق کی توثیق کر دی۔ پاکستان نے ان انتخابات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ۱۹۵۵ء میں پاکستان کی سیٹو اور سینٹو میں شرکت اور امریکی اسلحہ کی سپلائی کو بہانہ بنا کر بھارت نے کشمیر میں رائے شماری کرانے سے انکار کر دیا۔ ۱۹۵۷ء میں اقوام متحدہ نے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لیے مسٹر یارنگ کی قیادت میں ایک مشن بھیجا لیکن ہندوستان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ مشن بھی ناکام ہو گیا۔

قرارداد مقاصد :

مملکت کوئی ہو' ان کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو' وہ چند بنیادی اصولوں' ضابطوں' قوانین اور قاعدوں کی پابند ہوتی ہے اور ان ہی تمام ضابطوں اور اصولوں کے مجموعے کو اس ملک کا دستور کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد ہماری پہلی سیاسی اور انتظامی ضرورت یہی تھی کہ ہماری نوزائیدہ مملکت کے لیے کوئی دستور یا آئین مرتب کیا جائے اور چونکہ یہ مملکت اسلام کے نام پر حاصل کی گئی تھی اس لیے بنیادی تقاضہ یہی تھا کہ ابتداء ہی میں ارباب اقتدار اسلام کی بنیادیں اس مملکت میں مضبوط کریں۔

پاکستان کے دستور میں اسلامی دستور کے بارے میں شدید اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ ایک طرف مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا محمد اکرم خاں جیسے قدامت پسند تھے اور دوسری طرف ملک غلام محمد اور ہاشم گزدر جیسے بزعم خود روشن خیال لوگ اور لیاقت علی خاں نے مختلف خیال کے عناصر پر مشتمل ایک سب کمیٹی تشکیل دی تاکہ وہ قرارداد مقاصد (یعنی آئندہ دستور کے بنیادی اصولوں پر مشتمل قرارداد) مرتب کرے۔ کمیٹی میں اکثریت نے مولانا شبیر احمد عثمانی کا نقطہ نظر تسلیم کر لیا۔ ڈاکٹر عمر حیات ملک جیسے تعلیم یافتہ رکن دستوریہ نے بھی اس کی بھرپور حمایت کی۔ لیاقت علی خاں مرحوم قائد ملت نے بھی اس قرارداد کی توثیق کی اور یوں ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو دستوریہ نے اس قرارداد کو پاس کر دیا۔ پاس قرارداد مقاصد کی اپنی تعریف کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ "قرارداد مقاصد پاکستان آئین سازی کی تاریخ میں ایک بنیادی دستاویز تھی جس کے ذریعہ پاکستان کے نظریاتی اور عملی سمت متعین کی گئی۔"

قرارداد مقاصد کے اہم نکات حسب ذیل تھے :

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ ہرگاہ کہ تمام کائنات پر اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور ذات باری تعالیٰ نے ریاست پاکستان کو اس کے باشندوں کے ذریعہ جو اقتدار اپنے مقرر کردہ حدود کے اندر ودیعت کیا ہے وہ ایک مقدس امانت کی حیثیت کی رکھتا ہے اس لیے یہ دستور ساز اسمبلی عوام پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے پاکستان کی آزاد اور خود مختار ریاست کے لیے دستور مرتب کرنے کا عہد کرتی ہے۔

۲۔ ہرگاہ کے ریاست اپنے اقتدار اور اختیارات کا استعمال عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ کرے گی جس میں جمہوریت آزادی' مساوات' رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کی اسلامی تصریحات کے مطابق مکمل تعمیل ہوگی۔

۳۔ جس میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی شعبوں میں اپنی زندگی میں قرآن و سنت کی روشنی میں اسلامی تعلیمات اور مقتضیات کے مطابق بسر کرنے کے قابل بنایا جائے گا۔

۴۔ جس میں اقلیتوں کے لیے اس امر کا مناسب و موزوں اہتمام کیا جائے گا کہ وہ اپنے مذہب و عقیدے پر آزادی سے کاربند رہ سکیں اور اپنی ثقافت کو ترقی دے سکیں۔

۵۔ جس (دستور) کے ذریعہ پاکستان میں شامل یا اس سے الحاق شدہ علاقے یا وہ علاقے جو بعد میں پاکستان میں شامل ہوں گے یا اس سے ملحق ہوں گے وہ ایک وفاق کی تشکیل کریں گے جس میں وحدتوں کو خود مختاری حاصل ہوگی اور ان کی سرحدوں اور ان اقتدار اور اختیارات کی حدود کا تعین کیا جائے گا۔

۶۔ جس میں قانون اور اخلاق عامہ کے حدود کے اندر بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے ان حقوق میں برابری اور سماجی' اقتصادی اور سیاسی انصاف' آزادی فکر و اظہار اور آزادی عقیدہ اعتقادہ اور عبادت اور تنظیم سازی کی آزادی حاصل ہوگی۔

۷۔ جس میں اقلیتوں اور پسماندہ طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کے لیے مناسب دفعات کا اہتمام کیا جائے گا جس میں عدلیہ کی آزادی کا مکمل تحفظ ہوگا۔

۸۔ جس میں وفاق کے علاقوں کی سالمیت' وفاق کی آزادی اور اس کے ان تمام حقوق کا جن میں خشکی' سمندر اور فضا پر حاکمانہ اختیارات شامل ہیں تحفظ کیا جائے گا۔

تاکہ اہل پاکستان کو خوش حالی نصیب ہو اور وہ اقوام عالم میں اپنا جائز اور باوقار مقام حاصل کرسکیں اور عالمی امن و ترقی اور تمام انسانیت کی خوش حالی کے لیے اپنا بھرپور کردار انجام دے سکیں۔

(ب) قرارداد مقاصد کی خصوصیات :

اس قرارداد کے متن سے جو بنیادی خصوصیات سامنے آئی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ تمام کائنات پر اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور پاکستان کے عوام اختیار ان کو خدا کی مقرر کردہ حدود میں رہ کر بطور امانت استعمال کریں گے۔

۲۔ جمہوریت آزادی' مساوات' رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں پر اسلام کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

۳۔ اقتدار اعلیٰ کو عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ بروئے کار لایا جائے گا۔

۴۔ اقلیتوں کے مفادات اور ان کا تحفظ ہوگا ان کی مذہبی آزادی دی جائے گی۔

۵۔ شہریوں کی برابری کی بنیاد پر حقوق دیئے جائیں گے۔

۶۔ ملک کی آزاد اور خود مختار عدلیہ ہوگی۔

۷۔ پسماندہ طبقوں کے جائز مفادات کا تحفظ ہوگا۔

(ب) قرارداد مقاصد کی اہمیت :

قرارداد پاکستان کی آئین سازی کی تاریخ میں بنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس قرارداد سے ہی پاکستان کی نظریاتی اور عملی سمت کا تعین ہوا۔ اس قرارداد میں مغربی اور اسلامی دونوں قسم کی جمہوریت کا امتزاج پیش کیا گیا ہے اور یوں ممکنہ جمہوری خطرات کی پیش بندی کی گئی ہے۔ اس قرارداد میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے بعد عوامی حاکمیت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یعنی اس نظام قدرت کے عین مطابق ہے کہ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ اس قرارداد میں نہ صرف مسلمانوں کی اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کا ذکر ہے بلکہ اقلیتوں کے مذہبی تحفظ اور ثقافتی بقاء کا تذکرہ بھی ہے اور یوں اسلام کی وسیع النظری اور کشادہ دلی کے خواص بھی اس قرارداد میں سمو دیئے گئے ہیں۔ اس قرارداد کی اہمیت کا ایک اور قابل ذکر رخ یہ ہے کہ اس قرارداد کے ذریعہ آئین بنانے والوں کے لئے صحیح سمت متعین کردی گئی ہے

میجر اسکندر مرزا اور ۱۹۵۶ء کا دستور

جب محمد علی بوگرہ کا فارمولا مقبول ہونے لگا تو اختیارات کے حریص گورنر جنرل ملک غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا۔ اور دستور سازی کے کام کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ دریں اثنا فالج زدہ گورنر جنرل ملک غلام محمد چھٹی پر چلا گیا اور اس کی جگہ وزیر داخلہ میجر اسکندر مرزا نے لے لی۔ میجر اسکندر مرزا نے مسلم لیگی ارکان کو تشکیل حکومت کی دعوت دی۔ چنانچہ انھوں نے چوہدری محمد علی وزیر مالیات کو اپنا لیڈر چن لیا۔ چوہدری صاحب نے مشرقی پاکستان کے متحدہ محاذ کے تعاون سے ایک مخلوط وزارت قائم کر لی۔ اسی دوران مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان مساوات کا مسئلہ حل کرنے کے لئے مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو توڑ کر ایک وحدت (One-Unit) کی تجویز سامنے آئی۔ چنانچہ 3 اکتوبر 1955ء کو وحدت مغربی پاکستان کا مسودہ منظور کر کے 14 اکتوبر سے نافذ کر دیا گیا۔

ون یونٹ کے قیام کے بعد بڑی تیز رفتاری سے دستور سازی کا کام شروع کر دیا گیا اور اس طرح 9 برس کی کوششوں کے بعد 9 جنوری 1956ء کو اس قانون کا مسودہ دستور ساز اسمبلی میں پیش کر دیا گیا۔ 29 فروری کو اس کی منظوری دے دی گئی۔ 2 مارچ کو گورنر جنرل میجر اسکندر مرزا نے اس پر دستخط کر دیئے اور 23 مارچ 1956ء کو اسے ملک میں نافذ کر دیا گیا۔ اس دستور کے تحت گورنر جنرل کی بجائے صدر کا عہدہ متعین کیا گیا۔ چنانچہ اس دستور کی رو سے میجر اسکندر مرزا پاکستان کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔

۱۹۵۶ء کے دستور کی خصوصیات اسلامی دفعات کے جائزہ کے ساتھ

۱۔ موزوں نام

اس نئے دستور کی رو سے مملکت پاکستان کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان تجویز ہوا۔

۲۔ تحریری دستور

اس دستور کا حجم زیادہ نہ تھا اور یہ ۲۳۴ دفعات پر مشتمل تھا۔

۳۔ وفاقی دستور

یہ وفاقی نوعیت کا دستور تھا۔ وفاق جس ون یونٹ پر مشتمل تھا اس میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان شامل تھے' ان صوبوں میں یکسانیت پر خاص زور دیا گیا تھا۔

۴۔ پارلیمانی نظام

حکومت کے لئے پارلیمانی نظام تجویز کیا گیا تھا۔ صدر' ملک کا آئینی سربراہ تھا مگر انتظامیہ کے حقیقی اختیارات وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کے پاس تھے۔

۵۔ یک ایوانی مقننہ

قانون سازی کے لئے صرف ایک پارلیمنٹ رکھی گئی تھی جس کے تین سو ارکان تھے۔ اس طرح وفاق کی یہ ایک انفرادی مثال تھی جس میں مرکزی مقننہ کا صرف ایک ایوان تھا۔

۶۔ صدر کے انتخاب اور اختیارات کا تعین

اس دستور میں صدر کے انتخاب اور اس کے اختیارات کا تعین بھی کر دیا گیا تھا انتخاب کے سلسلے میں صدر کا مسلمان ہونا ضروری تھا' اس کا انتخاب مرکزی اور صوبائی اسمبلیاں مل کر کرتی تھیں۔ صدر کو مواخذہ کر کے علیحدہ کیا جا سکتا تھا۔

اختیارات کے سلسلہ میں اہم بات یہ تھی کہ صدر کو ملک کی اسمبلیوں اور کابینہ کا توڑ دینے کے اختیارات حاصل تھے اور اسے یہ اختیار بھی حاصل تھا کہ وہ صوبوں میں چھ ماہ تک صدارتی راج نافذ کر سکے۔

۷۔ بنیادی حقوق کی وضاحت

دستور میں افراد کے بنیادی حقوق کی صراحت بھی کر دی گئی تھی اور عدالتوں کو نفاذ کے اختیارات حاصل تھے۔

۸۔ ریاست کی حکمت عملی کے اصولوں کا تعین

دستور میں ریاست کی حکمت عملی کے تعین کے لئے بعض اصول بھی درج کئے گئے تھے جن کے تحت کہا گیا تھا کہ ملک میں جمہوریت' مساوات' رواداری اور معاشرتی انصاف کو فروغ دیا جائے گا اور اقلیتوں کے جائز مفادات کی حفاظت کی جائے گی

۹۔ بنگالی و اردو بطور سرکاری زبانیں

ملک کے لئے بنگالی اور اردو دونوں کو سرکاری زبانیں قرار دیا گیا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ فیصلہ بھی کیا گیا تھا کہ پچیس سال تک انگریزی بھی سرکاری زبان کے بطور مستعمل ہوگی اور اردو

وینگالی کی بتدریج اس کی جگہ لے گی۔

۱۔ دستور کی اسلامی دفعات کا جائزہ

اس دستور کو اسلامی روح دینے کے لئے ایک خاص کوشش ضرور کی گئی تھی جس کا پتہ ہمیں سب سے پہلے اسی امر سے چلتا ہے کہ اس کے نام میں ہی "اسلامی جمہوریہ" کے الفاظ شامل کئے گئے تھے۔

علاوہ ازیں بیان بالا میں جن نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی جو اسلام کی تعلیمات یا اس کے اصولوں سے متصادم ہوتی ہو۔ بلکہ دستور کی اسلامی حقیقت کو اجاگر کرتے ہوئے اس دستور میں علیحدہ سے چند اسلامی دفعات بھی شامل کی گئی تھیں جن کی نشاندہی یہ ہے :

(i) سربراہ حکومت ہونے کے لئے مسلمان ہونے کی شرط

سربراہ حکومت کے لئے لازم رکھا گیا تھا کہ وہ مسلمان ہو تاکہ اس اسلامی جمہوریہ کے تمام افعال کا اس طرح نگراں رہے کہ وہ قرآن وسنت کی منافی نہ ہونے پائیں۔

(ii) قرآن وسنت کے منافی قوانین کی منسوخی

دستور میں بطور خاص یہ دفعہ بھی شامل کی گئی تھی کہ جس ترمیم شدہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو رائج کیا جارہا ہے اس میں کوئی ایسا قانون شامل نہ ہونے پائے جس کے کسی بھی رخ سے قرآن وسنت کے احکامات کی نفی ہوتی ہو۔

(iii) قرآن وسنت کے مطابق قوانین کا نفاذ

ساتھ ہی ساتھ اس امر کو بھی دستور کا حصہ بنایا گیا تھا کہ جو قوانین وضع کئے جارہے ہیں ان کو قرآن وسنت سے ہم آہنگ رکھا جائے گا اور ایسے مزید اسلامی قوانین بھی وضع کئے جائیں گے

(iv) لازمی قرآنی تعلیم

دستور سازوں نے اس روشن حقیقت کے پیش نظر کہ قرآن کریم ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس دفعہ کو بھی دستور میں جگہ دی تھی کہ نصاب تعلیم میں قرآن کی تعلیم لازمی ہوگی۔

(v) فلاحی اور جبری مشقت کی ممانعت

اسلام نہ فلاحی کا ہمنوا ہے اور نہ جبری مشقت کا۔ چنانچہ اس دستور میں معاشرت اور

معیشت کو خوشگوار اور آزادانہ فضا دینے کے لئے یہ دفعہ بھی رکھی گئی تھی کہ پاکستان میں فلاحی اور جبری مشقت ممنوع ہوگی۔

(vi) خلاف شرع اعمال کی بندش

دستور کی دفعہ کے بطور اس بات کی وضاحت بھی کی گئی تھی کہ عصمت فروشی اور شراب و دیگر منشیات کا استعمال اور ان کی خرید و فروخت کو ممنوع رکھا جائے گا۔

(vii) عبادت کی آزادی

اسلام اقلیتوں کا محافظ ہے چنانچہ دستور کی ایک اسلامی دفعہ یہ بھی تھی کہ ہر شخص کو بلحاظ عقیدہ حق عبادت حاصل ہوگا۔

(viii) اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام

ایک اور اہم اسلامی دفعہ یہ تھی کہ اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ یہ کونسل اسلامی دستور کی تدوین و تشکیل کے فرائض انجام دے گی۔

۱۹۶۲ء کا دستورِ پاکستان

جواب : اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جب مارشل لا کا نفاذ ہوا تو محمد ایوب خان نے مارشل لا کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے اعلان کیا کہ نئی حکومت جمہوریت کو بحال کرنا چاہتی ہے۔ مگر وہ ایسی جمہوریت ہوگی جسے قوم سمجھ سکے اور چلا سکے۔ اس مقصد کے پیش نظر ۱۹۵۹ء میں بنیادی جمہوریتوں کا نظام قائم کیا گیا۔ اس نظام کو آئین کے نافذ ہونے سے پہلے ہی جاری کردیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آنے والے آئین میں صدر، مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران کا انتخاب عوام کے ووٹوں سے نہیں بلکہ بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کی رائے سے ہوتا تھا۔

اس آئین کی اہم خصوصیات مندرجہ ذیل تھیں:

۱۔ تحریری اور غیر لچکدار آئین

یہ آئین بھی ۱۹۵۶ء کے دستور کی طرح تحریری شکل میں سامنے آیا جس کی ابتدا میں کہا گیا تھا کہ اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور عوام کے پاس جو اختیارات ہیں وہ خدا کے امانت ہیں۔

دستور میں کہا گیا تھا کہ 'پاکستان میں جمہوریت' مساوات' اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کی پابندی کی جائے گی۔ اقلیتوں کے جائز مفادات کی حفاظت کی جائے گی۔ یہ دستور ۲۵۰ دفعات پر مشتمل تھا جو بارہ حصوں اور پانچ گوشواروں کا حامل تھا۔ یہ دستور تحریر ہونے کے باعث غیر لچکدار تھا۔ اس میں اسمبلی کی دو تہائی اکثریت ترمیم و اضافہ کر سکتی تھی

۲۔ وفاقی دستور

اس دستور کی رو سے پاکستان دو صوبوں پر مشتمل ایک وفاق کا قیام طے کیا گیا تھا۔ وفاق کا سب سے اہم اصول صوبائی اور مرکزی حکومتوں میں اختیارات کی تقسیم تھا۔ چنانچہ پاکستان کے دستور میں حکومت کا دائرہ کار متعین کرنے کے لئے مختلف امور کی فہرست دی گئی تھی جس کے متعلق صرف مرکزی حکومت کو قانون بنانے کا اختیار حاصل تھا۔ وفاقی اکائیاں ہر لحاظ سے برابر حیثیت کی مالک رکھی گئی تھیں اور ان میں سے کسی کو دوسری پر برتری حاصل نہ تھی۔

۳۔ ایک ایوانی مقننہ

۱۹۵۶ء کے دستور کی طرح اس دستور میں بھی ایک ایوانی مقننہ رکھی گئی تھی اسے قومی اسمبلی کا نام دیا گیا تھا جو ۱۵۶ اراکین پر مشتمل تھی۔ اسے دونوں صوبوں سے مساوی تعداد میں منتخب کرنا طے کیا گیا تھا۔

۴۔ عدلیہ کی برتری

وفاق میں اکائیوں اور وفاقی حکومت کے مابین دستور کی رو سے اختیارات کی تقسیم کر دی گئی تھی۔ ان اختیارات کی ضمانت دینے کے لیے ایک آزاد اور طاقتور عدلیہ کا قیام نہایت ضروری تھا تاکہ اگر صوبائی حکومتوں اور مرکزی حکومت کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کا فیصلہ عدلیہ کرلے۔

۵۔ صدارتی نظام

اس دستور کی رو سے پارلیمانی نظام کی بجائے صدارتی نظام رائج کیا گیا تھا۔ صدر کا انتخاب عوام بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر کرتے تھے۔ اس طرح صدر ایک عوامی نمائندہ ہوتا تھا۔ اسے مدت مقررہ سے پہلے اپنے منصب سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے فرائض کی بجا آوری کے لئے وزراء کا تقرر کرتا ہے۔ یہ وزراء اپنی تمام کارکردگی کے لئے صدر کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔

۶۔ عاملہ اور مقننہ کا تعلق

۱۹۶۲ء کے دستور کے تحت عاملہ کے وزراء کو مقننہ کے اجلاس میں شرکت کرنے کی اجازت تھی وہ بل پیش کر سکتے تھے اور بحث و تمحیص میں حصہ لے سکتے تھے۔ لیکن ووٹ نہیں دے سکتے تھے۔

۷۔ بنیادی حقوق و قومی زبان

پاکستانی شہریوں کو انیس بنیادی حقوق دیئے گئے۔ عدلیہ کو ان حقوق کا محافظ قرار دیا گیا۔ سرکاری طور پر اردو اور بنگالی قومی زبانیں قرار دی گئیں۔

۸۔ بالواسطہ انتخاب

صدر اور اسمبلیوں کے انتخاب کا طریقہ کار بالواسطہ رکھا گیا تھا۔ یعنی عوام پہلے بنیادی حقوق جمہوریتوں کے ارکان کا انتخاب کرتے اور اس کے بعد یہ اسی ہزار منتخب ارکان جن کی تعداد بعد میں ایک لاکھ بیس ہزار تک بڑھا دی گئی صدر اور قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کا انتخاب کرتے تھے۔ اس طریقہ انتخاب پر کڑی تنقید کی گئی تھی۔

۹۔ دارالحکومت

اس دستور کی رو سے پاکستان کے دو دارالحکومت قرار دیئے گئے۔ ایک مغربی پاکستان میں اسلام آباد اور دوسرا ڈھاکہ کا مشرقی پاکستان میں۔

اسلامی دفعات کا جائزہ

۱۹۵۶ء کے آئین کی طرح ہر چند آئین سازوں کی نیت نیک تھی مگر ان کا نقطہ نظر اسی انداز سے قدرے ترقی پسندانہ تھا کہ دستور میں اسلامی روح کے ساتھ ساتھ وقت اور دنیا کے تقاضوں کے ساتھ چلنے کی سکت موجود ہو۔ چنانچہ اسی نقطہ نظر کے ساتھ اس دستور میں جو پہلا اقدام کیا گیا وہ یہ تھا کہ نفاذ کے وقت مملکت کا نام وفاقی جمہوریہ پاکستان تجویز کیا گیا لیکن اس اقدام سے بنیادی طور پر بھی پاکستان کی اساسی نظریاتی حیثیت پر ضرب پڑتی تھی چنانچہ بعد میں ایک ترمیم کے ذریعہ اس کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا۔ اس میں جن اسلامی دفعات کو جگہ دی گئی وہ یہ تھیں: (i) اسلامیات کی لازمی تعلیم

دستور کی دفعہ کے بطور کہا گیا تھا کہ نصاب تعلیم میں اسلامیات کی تعلیم لازمی ہوگی۔ بلاشبہ

اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ انفرادی و اجتماعی زندگی اسلامی تعلیم کے سانچے میں ڈھل سکے۔

(ii) سربراہ پاکستان ہونے کے لئے مسلمان ہونے کی شرط

لازم قرار دیا گیا تھا کہ صدر پاکستان مسلمان ہوگا۔ یہ ۱۹۵۶ء کی اسلامی دفعہ کا اعادہ تھا۔

(iii) قرآن و سنت سے ہم آہنگ قوانین کا نفاذ

۱۹۵۶ء کے آئین ہی کی طرح اس امر کو بھی دستور کا حصہ رکھا گیا تھا کہ ملک میں جو قوانین نافذ ہوں گے وہ قرآن و سنت سے ہم آہنگ ہوں گے۔

(iv) خلاف شرع اعمال کے انسداد کے لئے عملی اقدام

۱۹۵۶ء کی ایک اسلامی دفعہ کے تحت خلاف شرع اعمال کی ممانعت کو دستور کا حصہ بنایا گیا تھا۔ موجودہ دستور میں اس جذبہ کو زیادہ حقیقی انداز میں اس طرح واضح کیا گیا کہ شراب، منشیات، سٹہ اور جوئے وغیرہ کے خاتمہ کے لئے عملی اقدامات کئے جائیں گے۔

(v) مشاورتی کونسل کا قیام

اس دستور کے تحت یہ بھی طے کیا گیا تھا کہ پارلیمنٹ کو اسلامی قوانین میں مشاورت کے لئے مشاورتی کونسل قائم کی جائے گی تاہم یہ گنجائش بھی رکھی گئی تھی کہ اگر حکومت چاہے گی تو اس کونسل کے مشوروں کو قبول کرے گی بصورت دیگر ان کو رد کرے گی۔

(vi) زکوۃ اوقاف و مساجد کی تنظیم

اس دستور میں نظام زکوۃ و اوقاف اور مساجد کے لئے ایک تنظیم کی ضرورت بھی واضح کی گئی تھی۔

: پاکستان کے ۱۹۷۳ء کے دستور کی خصوصیات

: ۱۹۷۳ء کے دستور کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ جمہوری نظام

۱۹۷۳ء کے دستور میں ملک کی حکومت کو جمہوری قرار دیا گیا۔ براہ راست انتخابات کے طریقہ کار کے تحت قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی تشکیل دی جائے۔ بالغ رائے دہی کا عمل طے کیا گیا۔ سینٹ کے ارکان کو منتخب کرنے کے لئے صوبائی اسمبلیوں کو اختیار دیا گیا۔

۲۔ وفاقی طرز حکومت

۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت نظام حکومت وفاقی تجویز کیا گیا۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کا دائرہ کار اور دائرہ اختیار متعین کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک فہرست ان امور کی ہوتی ہے جس پر دونوں مرکزی اور صوبائی حکومتیں قانون سازی کر سکتی ہیں۔ اس کو مشترکہ امداد کی فہرست کہتے ہیں۔

۳۔ پارلیمانی طرز حکومت

ماضی کی نسبت ملک کے لئے صدارتی طرز حکومت کی بجائے پارلیمانی طرز حکومت تجویز کیا گیا۔ تمام وزراء اسمبلیوں کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

۴۔ دو ایوانی مقننہ

ماضی کی نسبت ایک ایوانی مقننہ کی جگہ دو ایوانی مقننہ کو رواج دیا گیا۔ ایوان بالا کو سینٹ اور ایوان زیریں کو قومی اسمبلی کا نام دیا گیا۔ قومی اسمبلی کے ارکان کا انتخاب بالغ رائے دہی کے اصول پر براہ راست انتخاب کے ذریعہ ہوگا جب کہ سینٹ کے ارکان کو صوبائی اسمبلیوں کے ارکان منتخب کریں گے۔ صوبہ کی سطح پر مقننہ کا ایک ایوان ہوگا۔

۵۔ ترمیم کا عمل

دستور میں قومی اسمبلی دو تہائی اکثریت سے ترمیم کر سکتی ہے۔ ترمیم کے لئے سینٹ کی منظوری حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔

۶۔ تحریری دستور

ماضی کی طرح ۱۹۷۳ء کا دستور تحریری شکل میں ہے جس میں ریاست کے تمام شعبوں کے اختیارات کو بہ تفصیل بیان کیا گیا ہے اور شہریوں کے تعلقات کو بھی واضح کر دیا گیا ہے۔

۷۔ بنیادی حقوق

عدلیہ کی زیر نگرانی اور تحفظ میں تمام شہریوں کو سیاسی، معاشی، معاشرتی اور دیگر بنیادی حقوق مساوی طور پر دیئے گئے ہیں۔

۸۔ سرکاری زبان

اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے اور انگریزی کو آئندہ پندرہ سال کے لئے دفتروں میں

استعمال کرنا طے پایا ہے۔

۹۔ عدلیہ کی آزادی

۱۹۷۳ء کے دستور میں عدلیہ کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کرنے کا بھی اصول طے پایا اور عدلیہ کو مکمل دستور کا محافظ قرار دیا گیا۔

۱۰۔ معاشی عدل و انصاف

ملک میں عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ کے قیام کا اقرار کیا گیا اور اس مقصد کے لئے پارلیمنٹ کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ معاشی عدل و انصاف کی خاطر مناسب اقدام کرے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے فرائض

: ۱۹۶۲ء کے آئین کی طرح ۱۹۷۳ء کے آئین میں اسلامی نظریاتی کونسل قائم ہوئی تو اس کے فرائض یہ ٹھہرے۔

اسلامی مسائل پر رائے طلبی

صدر یا گورنر کسی بھی مسئلے پر اسلامی کونسل سے رائے طلب کر سکیں گے۔ اس کے علاوہ کسی صوبے کے اندر صوبائی اسمبلی کے ۲/۵ ارکین کی حمایت سے صوبائی اسمبلی کسی بھی مسودہ قانون کے بارے میں یہ معلوم کرنے کے لیے اسلامی کونسل کو بھیج سکے گی وہ اسلامی نوعیت کا ہے یا نہیں؟

کونسل کی طے شدہ شفارشات کی ترسیل

کونسل صوبائی اسمبلیوں یا پارلیمنٹ کو ایسی سفارشات پیش کر سکے گی جن میں ایسے طریقے بتائے گئے ہوں جن پر چل کر مسلمان انفرادی و اجتماعی زندگی اسلامی طرز حیات کا آئینہ دار بنا سکیں۔

حکومتی اداروں کو بل کی نوعیت پر مشاورت

وہ بوقت ضرورت صدر۔ گورنر، صوبائی اسمبلی یا پھر پارلیمنٹ کے کسی ایوان کے پوچھنے پر ان کو کسی بل کے بارے میں یہ بتائے گی کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق ہے یا نہیں۔

غیر اسلامی قوانین کی بتدریج تبدیلی

ایسی سفارشات مرتب کرے گی کہ غیر اسلامی قوانین بتدریج اسلامی انداز میں ڈھل سکیں۔

مطلوبہ جواب کی فراہمی کے لئے پندرہ روزہ پابندی

وہ کسی ادارہ حکومت یا کسی دوسرے ادارے یا فرد کو مطلوبہ جواب پندرہ دن کے اندر فراہم کرے گی۔

فوری تیار شدہ قوانین کا جائزہ

اگر فوری طور پر کوئی قانون بنالیا جائے گا اور کونسل اسے غیر اسلامی سمجھے گی تو وہ دوبارہ اسمبلی یا پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہوگا تاکہ اسلامی کونسل کی رائے کی روشنی میں اس پر دوبارہ غور کیا جاسکے۔

سالانہ رپورٹ کی تیاری

وہ ہر سال اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرے گی جسے دونوں ایوانوں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

طریقہ کار میں آزادی

دستور کی دفعہ ۲۳۱ کے تحت وہ اپنا طریقہ کار خود طے کرے گی۔

۱۹۷۳ء کے دستور کی اسلامی دفعات

۱۹۷۳ء کے دستور میں اسلام کا رنگ پہلے دونوں دستوروں کے مقابلے میں قدرے زیادہ نظر آتا ہے۔ اس میں وہ تمام دفعات موجود ہیں جو اس سے پہلے دساتیر میں رکھی گئی تھیں ان کے علاوہ بھی اس میں بہت سے شقیں مزید رکھی گئیں ہیں۔ ان دفعات کے مختلف پہلو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱ :۔ اسلامی جمہوریہ : مملکت کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہوگا اور اسلام سرکاری مذہب و دین ہوگا۔

۲ :۔ خدا کی حاکیت : ۱۹۷۳ء کے دستور میں خدا کی حاکیت کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے اس اعتبار سے مملکت خدا کی مرضی اور شریعت کو نافذ کرنے کی پابند ہے۔

۳ :۔ صدر اور وزیر اعظم کا مسلمان ہونا : پہلے دساتیر میں صدر کے لیے صرف

مسلمان ہونا ضروری تھا دستور ۱۹۷۳ء نے صدر اور وزیر اعظم دونوں کے لیے صحیح العقیدہ مسلمان ہونا ضروری قرار دیا ہے ان کو اپنا عہدہ سنبھالتے ہوئے باقاعدہ حلفاً اس کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔

۴ :۔ قوانین کی قرآن وسنت کی روشنی میں تدوین : دستور رائج الوقت تمام قوانین کو ۹ سال کے عرصہ میں قرآن وسنت کی روشنی میں ڈھال کر نافذ کرنے کا عزم کیا گیا ہے۔ اس لیے قوانین کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا تاہم غیر مسلم اقلیتوں کے شخصی قانون کو تسلیم کیا گیا ہے۔

۵ :۔ سود کا خاتمہ : دستور ۱۹۷۳ء میں ملکی معیشت کو سود کی لعنت سے پاک کرنے کا بھی عہد کیا گیا۔ البتہ اس سلسلے میں وضاحت کی گئی ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے بتدریج اقدامات کیے جائیں۔

۶ :۔ نظام زکوٰۃ کا نفاذ : دستور میں نظام زکوٰۃ کے نفاذ کا بھی وعدہ موجود ہے یعنی زکوٰۃ کو سرکاری اہتمام میں وصول کر کے مستحقین تک پہنچایا جائے گا۔

۷ :۔ اوقاف کا انتظام : اگرچہ اوقاف کا محکمہ جنرل ایوب کے دور میں قائم ہو گیا تھا لیکن ۱۹۷۳ء کے دستور میں اس کا بالالتزام ذکر کر کے اس کی اہمیت دی گئی ہے اور حکومت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ مسلم اوقاف کا انتظام و انصرام کرے۔

۸ :۔ اسلامی تعلیمات کا فروغ : ۱۹۷۳ء کے دستور میں اس امر کا وعدہ کیا گیا ہے کہ حکومت قرآن پاک اور اسلامیات کی لازمی تعلیم کی کوشش کرے گی تاہم یہ رہنما اصول ہے کہ جس کو عدالت کے ذریعہ نافذ نہیں کیا جاسکتا۔

۹ :۔ قرآن پاک کی صحیح طباعت : ۱۹۷۳ء کے دستور میں حکومت پاکستان کو قرآن پاک کی صحیح طباعت کا بھی ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔

۱۰ :۔ عربی زبان کی تعلیم : ۱۹۷۳ء کے دستور میں یقین دلایا گیا ہے کہ حکومت کی کوشش ہوگی کہ عربی زبان کی تعلیم کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرے۔

۱ :۔ اسلامی اصولوں کی ترویج : سابقہ دساتیر کی طرح ۱۹۷۳ء کے دستور میں حکومت پاکستان نے وعدہ کیا ہے کہ عوام کو اسلامی اصولوں سے آگاہ کیا جائے گا۔ نیز ایسے سازگار حالات

پیدا کئے جائیں گے جن میں پاکستان کے مسلمان اسلامی اصولوں کو اپنی انفرادی زندگی میں بھی نافذ کر سکیں اور ان کے اجتماعی معاملات بھی اسلام کی روشنی میں طے ہوں۔

۲ :۔ اسلامی نظریہ کونسل کا قیام : ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت اسلامی نظریہ کونسل کو تشکیل دیا گیا ہے۔ اسلامی دفعات کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں مناسب تجاویز پیش کرنے کی ذمہ داری اس کونسل کے سپرد کی گئی ہے۔

۳ :۔ قادنیوں کو اقلیت قرار دینا : ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت ختم نبوت پر ایمان نہ رکھنے والوں کو خارج از اسلام قرار دیا گیا ہے۔ اور ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا ہے۔

نفاذِ اسلام کے لئے حکومتی اقدامات

سبی میں قائداعظم نے قبائلی دربار سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا واحد ذریعہ اس سنہری اصولوں والے ضابطہ حیات پر عمل کرنا ہے: جو ہمارے عظیم واضع قانون پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کر رکھا تھا ہمیں اپنی جمہوریت کی بنیادیں سچے اسلامی اصولوں اور تصورات پر رکھنی چاہئیں۔"

قائداعظم نے فروری ۱۹۴۸ء میں نشری تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"اسلام کے بنیادی اصولوں کا اطلاق آج کی عملی زندگی پر بھی اسی طرح ہو سکتا ہے جس طرح تیرہ سو سال پہلے ہوتا تھا ہم نے اسلام اور اس کے نظریات سے جمہوریت سیکھی ہے۔ اسلام نے ہمیں انسانی برابری، انصاف اور رواداری کا درس دیا ہے۔ ہم ان عظیم الشان روایات کے وارث ہیں اور پاکستان کے مستقبل کے دستور کے بانی کی حیثیت سے ہم اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہیں۔ نفاذ اسلام کے سلسلہ میں جو ارتقاء ہوا اس کا بیان یہ ہے :

(ا) قرارداد مقاصد

نفاذ اسلام کے سلسلہ میں قرارداد مقاصد نے اہم کردار ادا کیا۔ قرارداد مقاصد میں کہا گیا کہ پوری کائنات کی حاکیت صرف اللہ کے پاس ہے تمام سیاسی اختیارات کا استعمال احکامات الٰہی کے تحت سماجی انصاف کے اصول کے مطابق کیا جائے گا۔ مساوات، رواداری، اجتماعی، سماجی

انصاف کے رہنما اصولوں پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عمل کیا جائے گا ملک کے مسلمانوں کو ان کی انفرادی اور اجتماعی حیثیت میں اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کی سہولت دی جائے گی جو قرآن و سنت کے مطابق ہوں گے۔

قرارداد مقاصد ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو پاس کی گئی اور بنیادی اصولوں کی کمیٹی میں بنائی گئی جس کی رہنمائی کے لئے تعلقات اسلامیہ بورڈ قائم کیا۔ علماء نے ۲۲ نکات پیش کئے جو نفاذ اسلام کے لئے ضروری ہے۔

(۲) ۱۹۵۳ء کا آئینی فارمولا

محمد علی بوگرہ نے ۷ ؍ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو دستور ساز اسمبلی میں جو آئینی فارمولا پیش کیا اس میں قرارداد مقاصد کو دستور کی تمہید بناتے ہوئے اس میں درج شدہ اصولوں کو مشعل راہ بنانے کا عہد کیا گیا۔

(۳) اسلامی دفعات کی قوانین اور ان کا نفاذ

۲۳ ؍ مارچ ۱۹۵۶ء کو پاکستان کا دستور نافذ کیا گیا اس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا اقرار کیا گیا۔ اسلام کے اصولوں کو ریاست کے رہنما اصول قرار دیا گیا اس بات کی ضمانت دی گئی کہ کوئی بھی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا پھر یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو دوسرا دستور نافذ کیا گیا۔ اس میں بھی نفاذ اسلام کی کوشش کی گئی۔ اسلامی طرز زندگی کے احیاء کا وعدہ کیا گیا۔ پاکستان کا تیسرا دستور ۱۴ ؍ اگست ۱۹۷۳ء کو نافذ کیا گیا اور کہا گیا کہ پورے قانونی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی نظام کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کیا جائے گا ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے مارشل لاء کا نفاذ کر کے افواج پاکستان کو ملک کے نظم و نسق کی ذمہ داری تفویض کردی۔ انہوں نے ۲۴ ؍ مارچ ۱۹۸۱ء کی زیادہ تر دفعات شامل ہیں ۱۹۷۳ء کے دستور کی اسلامی روح کو مد نظر رکھتے ہوئے ۱۲ ؍ ربیع الاول ۱۳۹۹ھ کو اسلامی نفاذ کی خاطر چند اہم اعلانات کئے جن کے مطابق چوری اور حرام کاری جیسے جرائم کی خاطر اسلامی سزائیں نافذ کی گئیں۔ اسلامی نظام معیشت کے نفاذ معاشی عدل کے قیام اور غربت کے خاتمہ کے لئے ۲۰ ؍ جون ۱۹۸۰ء سے ملک بھر میں زکوٰۃ اور عشر کا نظام نافذ کیا گیا۔ نفاذ اسلام کی رفتار تیز کرنے کے لئے جون ۱۹۸۱ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کو دوبارہ تشکیل دیا گیا۔

(۴) شریعت بینچیں

عدل و انصاف کے تقاضوں کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں پورا کرنے کے لئے شریعت بینچوں کا قیام عمل میں لایا گیا اور وفاقی شرعی عدالت قائم کی گئی۔ ملکی معیشت کو سود سے پاک کرنے کے لئے یکم جنوری ۱۹۸۱ء سے سود سے پاک بینکاری کو رائج کر دیا گیا۔

اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لئے عملی کاروائی کے طور پر مختلف یونیورسٹی میں شریعت فیکلٹی قائم کی گئیں اسلام آباد میں نئی اسلامی یونیورسٹی قائم کی گئی عریانی کی بڑھتی ہوئی لعنت اور دیگر معاشرتی برائیوں کے انسداد کے لئے احکامات جاری کئے گئے ہیں۔

اپریل ۱۹۷۹ء میں اسلامی تعلیمات اور مطالعہ پاکستان کو لازمی مضمون قرار دیا گیا ایسے تمام لٹریچر کی درآمد اشاعت، نمائش اور فروخت ممنوع قرار دی گئی ہے جن سے ملک کی نظریاتی اساس پر زد پڑتی ہو۔

عسکری اور جغرافیائی اعتبار سے پاکستان کے محل وقوع پر روشنی

محل وقوع : پاکستان جنوبی ایشیا کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ گلوب یعنی کرۂ ارض پر پاکستان کا علاقہ 23.45 اور 36.75 شمال عرض البلد اور 6p اور 75.5 مشرق طول بلد کے درمیان واقع ہے۔ پورے برصغیر کی حیثیت ایک جزیرہ نما کی سی ہے جس کو ہمالیہ پہاڑ اور اس کی شاخیں براعظم کی شمالی حصے سے جدا کرتی ہیں۔

پاکستان کے شمال مغرب میں کوہستان ہمالیہ کا سلسلہ ہے۔ افغانستان کی پٹی واخان جس کی چوڑائی ۲۰ کلومیٹر ہے۔ پاکستان کو روسی ترکستان سے جدا کرتی ہے۔ شمال مشرق کی طرف علاقہ گلگت، تبت اور کشمیر کی حدوں سے ملحقہ ہیں۔ پاکستان کے مغرب میں افغانستان اور جنوب مغرب میں ایران واقع ہے۔ مشرق کی طرف بھارت کی ریاستیں مشرقی پنجاب اور راجستھان واقع ہیں۔

آبادی، رقبہ، صوبے اور صدر مقام :

پاکستان کا کل رقبہ ۷۹۶۰۹۶ مربع کلومیٹر ہے اور ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق کل آبادی ۸۳۲۵۳۶۴۴ نفوس پر مشتمل ہے، صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان، ان صوبوں کے صدر مقام بالترتیب پشاور، لاہور، کراچی اور کوئٹہ ہیں۔ پاکستان کا دارالحکومت اسلام آباد ہے اور بلحاظ آبادی سب سے بڑا صوبہ پنجاب ہے۔ جبکہ بلحاظ رقبہ سے بڑا صوبہ بلوچستان ہے۔

پاکستان کے محل وقوع کی اہمیت :

پاکستان کو جنوبی ایشیا میں انتہائی اہم حیثیت حاصل ہے۔ بحر عرب کے سرے پر واقع ہونے کے باعث یہ خلیج فارس کی ریاستوں کے لئے جو معدنی تیل کی دولت سے مالا مال ہیں۔ فوجی نقطہ

نگاہ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایشیا اور یورپ کے درمیان بحری رابطہ پر بھی پاکستان دفاعی لحاظ سے انتہائی اہم جگہ ہے۔ چونکہ بحر ہند آج کل بین الاقوامی سیاست میں خصوصی توجہ کا مرکز ہے اس لئے پاکستان کی حیثیت سے پہلے سے زیادہ اہمیت اختیار کرگئی ہے۔ پاکستان یورپ کو خشکی کی راہ سے بحر ہند تک پہنچنے میں مدد دے سکتا ہے۔ پاکستان کے تمام اطراف میں بحری ہوائی تجارت کے راستے واقع ہیں۔ پاکستان کا جغرافیائی محل وقوع اس کی ایسی امتیازی خصوصیت ہے جو برصغیر کے اور کسی علاقہ کو حاصل نہیں۔ مشرق و مغرب کے درمیان نظریاتی تصادم خصوصیت سے ایرانی انقلاب اور افغانستان میں روسی مداخلت سے پاکستان کو دفاعی نقطہ نظر سے اور زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ مغربی بلاک اور کمیونسٹ ممالک دونوں اپنے اپنے حلقہ اثر میں لانا چاہتے ہیں۔

اگرچہ پاکستان کی جغرافیائی حیثیت اسے خصوصیت مراعات کا مستحق ٹھہراتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے چند خطرات بھی لاحق ہو سکتے ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اپنے مخصوص جغرافیائی محل وقوع کی بنا پر پاکستان بین الاقوامی سیاست کا موضوع اور محور بن سکتا ہے۔ مخصوص محل وقوع کے باعث پاکستان دنیا کے متعدد ممالک سے تجارتی تعلقات قائم کرسکتا ہے لیکن اس کی راہ میں قدرتی بندرگاہوں کی کمی حائل ہے۔ پاکستان کو خدا نے قدرتی وسائل اور بہترین زرعی زمین سے نوازا ہے اس کی جغرافیائی پوزیشن بڑی اہم ہے جسے بین الاقوامی تعلقات کے جدید دور میں پیش نظر رکھنا چاہئے۔ بڑی طاقتوں کی کش مکش میں پاکستان اپنے محل وقوع سے پورا فائدہ اٹھاسکتا ہے۔

پاکستان کی آب و ہوا اور خطے

کسی مقام کی ایک لمبے عرصے کے لئے ہوا کی کیفیت، درجہ حرارت ہوا کے دباؤ اور ہوا میں نمی، تیز بارش کی اوسط کو مجموعی طور پر اس مقام کی آب و ہوا کہا جاتا ہے۔ پاکستان کی آب و ہوا جغرافیائی اصطلاح میں شدید نوعیت کی ہے۔ یعنی موسم گرما اور موسم سرما کے درجہ حرارت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ موسم سرما کے درجہ حرارت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ موسم گرما میں گرمی کافی پڑتی ہے اور موسم سرما خاصا سرد ہوتا ہے۔ پاکستان میں موسم گرما مئی سے ستمبر

تک ہوتا ہے۔ موسم سرما نومبر سے فروری تک جاری رہتا ہے۔ مارچ، اپریل، ستمبر اور اکتوبر میں نہ زیادہ گرمی ہوتی ہے نہ زیادہ سردی۔ مارچ، اپریل کے موسم کو ہم موسم بہار کا نام دیتے اور ستمبر، اکتوبر کے موسم کو موسم خزاں کہا جاتا ہے۔ پاکستان کے بیشتر علاقوں میں موسم گرما میں عام طور پر وسط جولائی سے ستمبر تک بارشیں بھی ہوتی ہیں اسے برسات کا موسم کہتے ہیں۔

درجہ حرارت کے اعتبار سے پاکستان کو عام طور پر چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(الف) شمال اور شمال مغربی پہاڑی علاقے:

ان علاقوں میں موسم سرما میں شدید سردی پڑتی ہے۔ درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی گر جاتا ہے یہاں سردی کا عرصہ چھ سے آٹھ ماہ چلتا ہے۔

(ب) دریائے سندھ کا بالائی میدان:

اس علاقہ میں مخصوص بری آب و ہوا پائی جاتی ہے۔ موسم گرما میں یہاں سخت گرمی پڑتی ہے موسم سرما کے دوران چند ہفتوں تک خوب لو چلتی ہے۔ جون کا مہینہ گرم ترین ہوتا ہے موسم سرما میں خاصی سردی پڑتی ہے لیکن یہ سردی شمال اور شمال مغربی پہاڑی علاقے کی سردی سے کم ہوتی ہے۔

(ج) سندھ کا زیریں میدان اور ساحلی علاقہ:

نسیم بحری اور نسیم بری کے سبب ساحلی علاقوں کا درجہ حرارت بڑھنے نہیں پاتا۔ سردیوں میں بھی موسم میں کوئی خاص شدت پیدا نہیں ہوتی۔

(د) سطح مرتفع بلوچستان اور تھر کا ریگستان:

موسم گرما میں بلوچستان اور تھر کا ریگستانوں میں اکثر جگہ شدید گرمی پڑتی ہے۔ سبی گرم ترین علاقہ ہے۔ موسم گرما میں راتیں بہر حال خوشگوار ہوتی ہیں۔ سردیوں میں پہاڑی علاقے میں خاصی سردی پڑتی ہے کوئٹہ اور دوسرے علاقوں میں برف باری ہوتی ہے۔

پاکستان کی آب و ہوا کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان اور مون سون کے تعلق کی نشاندہی بھی ضروری نظر آتی ہے۔ پاکستان مون سون ہواؤں کے خطے میں واقع ہے یہ ہوائیں موسم گرما میں سمندر سے خشکی کی طرف اور موسم سرما میں خشکی سے سمندر کی طرف چلتی ہیں۔ ان میں پہلی ہواؤں کو موسم گرما کی مون سون ہوائیں کہتے ہیں اور دوسری ہوائیں موسم سرما مون سون کہلاتی ہیں۔ ان کی مزید وضاحت یہ ہے۔ (۱) موسم گرما کی مون سون:

موسم گرما میں جنوبی ایشیا کے میدانی علاقے خوب گرم ہو جاتے ہیں۔ ہوا گرم ہو کر اوپر اٹھتی ہے اور پاکستان کے علاقے میں بھی ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے ہوا کے دباؤ کی کمی کو پورا کرنے کے لیے خلیج بنگال اور بحرۂ عرب کی ہوائیں خشکی کی طرف چلتی ہیں۔ یہ بخارات سے پر ہوتی ہیں اور شمال میں پہاڑی سلسلے سے ٹکرا کر پاکستان میں بارش لاتی ہیں۔

(۲) موسم سرما کی مون سون:

اس موسم میں خشکی علاقے سمندر کی نسبت جلد ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ سمندری علاقے گرم رہتے ہیں اس لیے ہوائیں خشکی کے علاقوں سے سمندر کی طرف چلنا شروع کر دیتی ہیں۔ یہ ہوائیں چونکہ خشکی سے آتی ہیں اس لیے بارش کا سبب نہیں بنتیں۔

موسم سرما میں پاکستان کے جنوبی اور شمالی علاقوں میں جو بارش ہوتی ہے۔ اس کے بخارات سے لدے ہوئے گردباد خلیج فارس اور بحرۂ روم سے آتے ہیں۔ صوبہ سرحد کے بعض علاقوں میں بھی موسم سرما کی بارشیں گردوباراں کے سبب ہوتی ہیں۔

آب و ہوائی خطے:

سالانہ درجہ حرارت، سالانہ بارش اور مجموعی فضائی کیفیات کو مدنظر رکھتے ہوئے پاکستان کو درج ذیل آب و ہوائی خطوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

(۱) سرد آب و ہوائی کا شمال اور شمال مغربی پہاڑی خطے:

اس خطہ میں پاکستان کے تمام شمالی پہاڑی اور شمالی مغربی پہاڑی علاقے شامل ہیں۔ یہاں موسم سرما انتہائی سرد ہوتا ہے۔ اور اس موسم میں برف باری تقریباً ۲۰۰۰ میٹر سے زیادہ بلند علاقوں پر ہوتی ہے۔ بحرۂ روم کے مغربی گردوبار مغربی علاقوں تک پہنچتے ہیں۔ نتیجتاً شمالی علاقوں میں بارش اور شمال پہاڑی پر برف باری ہوتی ہے۔ اونچے پہاڑوں پر خاص برف باری ہوتی ہے جو چھوٹے بڑے گلیشیئروں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جنوری فروری میں شمالی پہاڑی علاقوں میں جہاں بلندی ۲۰۰۰ میٹر سے زیادہ ہے درجہ حرارت نقطہ انجماد سے گر جاتا ہے۔

(۲) شدید آب و ہوا کا شمالی میدانی خطہ:

یہ خطہ شمالی پہاڑی علاقوں کے دامن سے شروع ہو کر جنوب میں جہاں دریائے سندھ کے

تمام معاون دریا آپس میں ملتے ہیں۔ وہاں تک پھیلا ہوا ہے یہ موسمی لحاظ سے انتہائی شدید آب و ہوا کا خطہ ہے۔ مئی جون اور جولائی کے مہینے سخت ہوتے ہیں۔ ان ہی دنوں میں وسط ایشیاء میں کم ہوا کے دباؤ کا ایک بڑا علاقہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ جو بحرہند سے ہواؤں کو کھینچتا ہے یہ موسم گرما کی مون سون ہوائیں ہوتی ہیں ۱۵ جولائی تک یہ مون سون میدانی علاقوں کو متاثر کر دیتی ہیں اور خوب بارش برساتی ہیں ستمبر میں بارش کی شدت کم ہوجاتی ہے موسم سرما میں کافی سردی پڑتی ہے اور خشکی ہوتی ہے۔ لیکن بحرۂ روم سے آنے والے گردباد کی بارش سے خشکی ختم ہوجاتی ہے۔ یہ بارش اس موسم کی فصلوں کے لیے بہت مفید ہوتی ہے۔

(۳) بری آب و ہوا کا سطح مرتفع بلوچستان کا خطہ:

بلوچستان کا شمال مغربی علاقہ اس خطے میں شامل ہے یہاں موسم گرما میں درجہ حرارت بہت زیادہ ہوتا ہے سبی اور جیک آباد کے علاقے اس خطے میں واقع ہیں۔ موسم سرما میں خاصی سردی پڑتی ہے۔ جہاں بلند پہاڑ ہیں وہاں برف بھی ہوتی ہے۔

ساحلی علاقوں میں سمندر کی نزدیکی کے سبب درجہ حرارت میں خاصی کمی رہتی ہے سردیوں میں بلوچستان کی آب و ہوا عموماً انتہائی خوشگوار رہتی ہے۔ اور درجہ حرارت میں اوسط ۸ سے ۲ ڈگری سینٹی میٹر تک رہتا ہے۔ مغرب کی طرف سے آنے والے گردبارش برساتے ہیں یہ سال کے تقریباً ۸۰ فی صد کے برابر ہوتی ہے۔

(۴) زیریں وادی سندھ اور ریگستان تھر کا خطہ:

سی کوہ کھیر تھر کے دامن کے میدانی علاقے اور ریگستان تھر میں خشک اور شدید آب و ہوا ملتی ہے یہاں ساحل سے قریب ہوا میں کچھ نمی رہتی ہے۔ جب کہ ساحل سے ۲۰ کلو میٹر دور کے علاقوں میں شدید گرمی پڑتی ہے۔ ہوا میں نمی ہونے کے سبب گرمی کی تمازت سے برداشت سے باہر ہوجاتی ہے۔ جب کہ تھر کے علاقے میں نسیم سحری اور نسیم بری جو کہ دن رات سمندر سے ساحل اور ساحل سے سمندر کی چلتی رہتی ہیں۔

پاکستان کی قدرتی خطوں میں تقسیم

جواب : جغرافیائی لحاظ سے ان علاقوں کو جہاں کی طبعی کیفیات، آب و ہوا اور قدرتی نباتات ایک جیسی ہوں۔ قدرتی خطے کہا جاتا ہے اس تعریف کی روشنی میں ہم پاکستان کو چھ قدرتی خطوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) شمالی پہاڑ:

یہ پہاڑ چار بڑے سلسلوں پر مشتمل ہیں :

(الف) شوالک کی پہاڑیاں :

یہ کم بلند پہاڑوں کی قطاریں ہیں اور میدان سندھ کے متصل شمال میں واقع ہیں۔ ان کی بلندی ۳۰۰ میٹر سے ۱۰۰۰ میٹر تک ہے۔

(ب) پیر پنجال کے پہاڑی سلسلے :

یہ شمال کی طرف شوالک کے متوازی واقع ہیں ان کی اوسط بلندی تقریباً ۵۰۰۰ میٹر ہے۔

(ج) ہمالیہ اعظم :

یہ پیر پنجال کے عقب میں واقع ہیں۔ اور مستقل برف سے ڈھکے رہتے ہیں اوسط بلندی ۶۵۰۰ میٹر ہے۔

(د) لداخ کا پہاڑی سلسلہ :

اسے اندرونی ہمالیہ بھی کہا جاتا ہے۔ ہمالیہ کے پہاڑ کشمیر اور گلگت ہیں۔ ہمالیہ کے شمال کی طرف کوہ قراقرم واقع ہے، جس کی بلند ترین چوٹی کے۔ ٹو ہے۔ شمال مغرب میں کوہ ہندوکش واقع ہے۔ ہمالیہ کے پار پہاڑی سلسلے وسطی ایشیاء اور پاکستان کے درمیان نقل و حمل میں رکاوٹ ہیں۔ یہ مون سون کو روکتے اور بارش کا سبب بنتے ہیں۔

(۲) مغربی پہاڑ :

ان میں کوہ ہندوکش کے مغرب میں واقع کم بلند سلسلہ ہائے کوہ شامل ہیں۔ ان میں سوات، چترال کے پہاڑ کوہ سفید وزیرستان کی پہاڑیاں کوہ سلیمان اور کوہ کرتھار واقع ہیں۔ ان پہاڑوں پر بارش کم ہوتی ہے اور یہ سال کے بیشتر دنوں میں خشک رہتے ہیں۔

(۳) کوہستان نمک اور سطح مرتفع پوٹھوار :

کوہستان نمک دریائے جہلم کے مغربی کنارے پر واقع جوگی ٹیلہ اور بکرالہ کی پہاڑوں سے شروع ہو کر شمال مغرب کی طرف ہوتا ہوا اضلاع بنوں کے بعد کوہ سلیمان سے جاملتا ہے۔ اس کی

اوسط بلندی صرف سات سو میٹر ہے۔ اس کے شمال میں سطح مرتفع پوٹھوار واقع ہے جس کی اونچائی تین سو سے چھ سو میٹر تک ہے اس علاقہ میں بعض جگہیں قابل کاشت ہیں لیکن زیادہ تر علاقہ پتھریلا ہے۔ البتہ معدنی ذخائر سے یہ علاقہ مالا مال ہے۔ دنیا میں معدنی نمک کے سب سے بڑے ذخائر یہیں واقع ہیں۔ کھیوڑہ اور کالا باغ کی کانوں سے صدیوں سے نمک نکالا جا رہا ہے۔ پیٹرولیم کے معاملے میں اگرچہ پاکستان ابھی خود کفیل نہیں ہوا۔ کھیوڑہ، ڈھلیان، جویا میر، بالکر، کرسال، منت کوٹ سارنگ نیال ادھی وغیرہ کے علاقہ میں تیل دریافت ہوا ہے۔ پاکستان میں معدنی کوئلہ کے مقامات میں سے ڈنڈوت، پنڈہ اور مکروال کا تعلق اسی علاقہ سے ہے۔

(۴) سطح مرتفع بلوچستان :

کوہ سلیمان اور کوہ کرتھار کے مغرب میں واقع ہے ۳۰۰ میٹر سے ۹۰۰ میٹر تک بلند ہے۔ توبہ کاکڑ اور چغائی کے پہاڑ اسے افغانستان سے جدا کرتے ہیں۔ اس میں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ کوئی قابل ذکر دریا نہیں۔ زرعی نقطہ نگاہ سے یہ علاقہ زیادہ کارآمد نہیں ہے۔ بارش کا پانی زمین دوز نہروں (کاریز) میں جمع کر لیا جاتا ہے۔ اس پانی سے پھلوں کے باغات کو سینچا جاتا ہے۔ پھلوں کے علاوہ قدرت نے اسے معدنی ذخائر سے بھی بڑی فیاضی سے نوازا ہے کوئلہ، لوہا، تانبا، کرومائیٹ اور قدرتی گیس کی دریافت نے اس علاقہ کی اہمیت میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔ سوئی کے مقام سے نکلنے والی قدرتی گیس پاکستان کے بہت سے علاقوں میں گھریلو اور صنعتی مقاصد کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

(۵) دریائے سندھ کا میدان :

کوہستان نمک سے جنوب سے شروع ہو کر بحرۂ عرب کے ساحل تک پھیلا ہوا ہے اسے دریائے سندھ اور اس کے معاونین ستلج، راوی، چناب اور جہلم سیراب کرتے ہیں۔ یہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔

(الف) بالائی سندھ کا میدان :

اس میں پنجاب کا علاقہ شامل ہے جو اس خطہ کو زرخیزی اور شادابی سے ہمکنار کرتے ہیں۔ یہ دریا مٹھن کوٹ کے مقام پر دریائے سندھ سے جا ملتے ہیں۔ یہ سطح سمندر سے ۱۰ تین سو میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ اسے دنیا کے زرخیز ترین علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

(ب) زیریں سندھ کا میدان :

یہ صوبہ سندھ کے اس میدان پر مشتمل ہے جہاں دریائے سندھ، پنجاب کے دریاؤں کا پانی ساتھ لے کر بہتا ہے۔ یہاں اس کی رفتار بہت سست ہے اس علاقہ میں گدو، سکھر اور کوٹری کے مقام پر دریائے سندھ پر بیراج تعمیر کر کے زرعی مقاصد کے لئے پانی حاصل کیا جاتا ہے۔

(۶) تھر اور تھل کے ریگستانی اور نیم ریگستانی علاقے :

رن کچھ کے دلدلی علاقے کے شمال میں ہندوستان کی سرحد اور ناراسر کے درمیانی علاقے کو تھر کا ریگستان کہتے ہیں۔ یہ تمام ریگستان ہوا کے عمل سے طولانی، برفانی اور وسطی ٹیلوں پر مشتمل ہے۔ جس میں کہیں درخت نہیں اگتے صرف مکئی اور تیل کے بیجوں کی کاشت کی جاتی ہے تاہم یہاں عمدہ قسم کے مویشی پالے جاتے ہیں۔

دریائے جہلم کے مغرب میں ریتلا علاقہ تھل کہلاتا ہے۔ جناح بیراج سے نہریں نکال کر اب اس کی ریگستانی حیثیت کو بہت کچھ بدلا جا چکا ہے۔

پاکستان کے معدنی وسائل

زمین کھود کر جو تیل، کوئلہ، لوہا اور مختلف قسم کی دھاتیں نکالی جاتی ہیں ان کو معدنیات کہا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں لوگوں کو یہ علم نہ تھا کہ ملک کے کون سے حصے معدنیات سے مالا مال ہیں۔ لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ انسان نے زمین کی گہرائیوں میں چھپے خزانوں کو بھی ڈھونڈ نکالا۔ ان ہی معدنیات یا معدنی وسائل نے ملکوں کی صنعتی ترقی میں اپنا کردار انجام دیا جن ممالک کے پاس زیادہ معدنی ذخائر تھے انہوں نے اقتصادی اور صنعتی طور پر نمایاں ترقی کی۔

اس وقت تک ہمارے معدنی وسائل درج ذیل ہیں۔

(۱) پیٹرولیم (معدنی تیل) :

صنعتی ترقی کے لیے پیٹرول یا معدنی تیل بھی اتنا ہی اہم ہوتا ہے کہ جتنا کوئلہ جدید نقل و حمل کے ذرائع اسی کی مدد سے چلتے ہیں۔ پاکستان میں تیل کے ذخائر ضلع اٹک، ڈیرہ غازی خاں اور ڈھوڈک (پنجاب) میں دریافت ہوئے ہیں۔ ضلع حیدرآباد اور بدین سندھ میں بھی تیل

دریافت ہوا ہے۔ ساحلی علاقے میں بھی پیٹرول مل چکا ہے۔

اٹک جہلم اور چکوال کے اضلاع سے جو خام تیل ملتا ہے وہ راولپنڈی کے نواح میں مورگاہ کے مقام پر ریفائنری میں صاف کیا جاتا ہے۔ تیل صاف کرنے کے دو کارخانے کراچی میں بھی ہیں جو سندھ سے نکلنے والے تیل اور درآمد شدہ تیل کو صاف کرتے ہیں۔

ابھی تیل کے سلسلہ میں پاکستان خود کفالت کی منزل سے بہت دور ہے۔ ہمارے یہاں تیل کی سالانہ کل پیداوار ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۳.۹۶ ملین یو۔ایس بیرل تھی جب کہ اگست ۱۹۸۶ء میں اس کی روزانہ پیداوار ۴۰،۰۰۰ بیرل تک جا پہنچی ہے ہمیں توقع کرنی چاہئے کہ اگر ہم معدنی تیل کی پیداوار میں کامیاب ہوتے رہے تو ہمارے ملک کی معیشت پر اس کے نہایت مفید اور خوشگوار اثرات پیدا ہوں گے۔

(۲) قدرتی گیس :

صنعتی دور میں قدرتی گیس کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ گیس معدنی تیل کی بخاراتی حالت ہے۔ پاکستان میں ۱۹۵۲ء میں اس کی تلاش کا کام جاری تھا کہ بلوچستان میں سوئی کے مقام پر گیس کا ایک بڑا ذخیرہ دریافت ہوا۔ اور اسی تعلق سے اس قدرتی گیس کو "سوئی گیس" کا نام دیا گیا۔

سوئی گیس کی دریافت نے پاکستان میں ایک نئے صنعتی باب کا آغاز کیا۔ اسے پائپ لائین کے ذریعہ ملک کے مختلف مقامات تک پہنچایا گیا ہے۔ ایک پائپ لائن سکھر اور حیدر آباد کے راستہ کراچی گئی ہے اور دوسری ملتان، فیصل آباد کے راستہ لاہور تک گئی ہے۔ فیصل آباد سے ایک اور پائپ لائن روالپنڈی اسلام آباد سے گذرتی واہ تک جاتی ہے۔ حال ہی میں ایک پائپ لائن کے ذریعے سوئی سے کوئٹہ تک گیس کی ترسیل کو ممکن بنایا گیا ہے۔

ہمیں اب جن مقامات سے یہ گیس حاصل ہو رہی ہے ان میں سوئی، اچہ، خیرپور، مزاتی، سدنی تنگ ڈھوڈک، پیرکوہ، ڈھیلیاں مری اور بدین وغیرہ شامل ہیں۔

(۳) کوئلہ :

ہرچند ہمارے یہاں اچھے قسم کا کوئلہ نہیں ملتا تاہم ۳ بڑے علاقوں میں اس کے ذخائر موجود ہیں۔

(۱) کوہستان نمک　　(۲) شمال مشرقی بلوچستان　　(۳) سندھ کی زیریں وادی

اس کی بڑی کان کوہستان نمک میں مکڑوال کے علاقے میں ہے۔ اسی علاقہ کے ڈنڈوت اور پدھ کے مقامات پر بھی کوئلہ ملتا ہے۔ شمال مشرقی بلوچستان میں اس کی کانیں شارگ ہرنائی، شیریں آب بولان اور مچھ کے علاقوں میں ہیں۔ شارگ میں کوئلے پروسنگ پلانٹ بھی نصب کیا گیا ہے۔ سندھ کے زیریں علاقے میں کوئلے کی کانیں جھمپیر اور لاکھڑا میں ہیں۔

اس وقت ہماری کوئلہ کی سالانہ پیداوار دس سے پندرہ لاکھ ٹن ہے۔ اور چونکہ اس کی کوالٹی ناقص ہے اس لیے ہم اسے برتنوں کی صنعت اور حرارتی بجلی وغیرہ کے لیے استعمال میں لا رہے ہیں۔

(۴) لوہا :

لوہا ایک نہایت کارآمد دھات ہے۔ کوئلہ کی طرح ہمارے یہاں عمدہ قسم کا لوہا بھی نہیں ملتا۔ تاہم اس کے جو ذخائر دریافت ہوئے ہیں وہ کالا باغ، مکڑوال، ہزارہ، چترال نوکنڈی اور چاغی وغیرہ میں ہیں۔ ان میں چترال اور نوکنڈی کے لوہے کی کوالٹی قدرے عمدہ ہے۔

(۵) معدنی نمک :

نمک بھی ہماری روزمرہ زندگی کی بڑی کارآمد چیز ہے۔ کھانوں کے علاوہ اسے صنعتی مقاصد اور ادویات کے لیے بھی استعمال میں لایا جاتا ہے۔ عام طور پر دنیا کے دوسرے ممالک میں سمندر کے پانی کو خشک کرکے نمک حاصل کیا جاتا ہے۔ مگر پاکستان کو یہ فخر حاصل ہے کی دنیا کی سب سے بڑی نمک کی کانیں اسی کی سرزمین پر ہیں۔ سب سے بڑی کان کھیوڑا کی ہے۔ اس کے علاوہ واڑچھ، کالا باغ، بہادر خیل اور کرک کے مقامات پر بھی نمک ملتا ہے۔ کراچی کے نزدیک ماری پور اور ساحل مکران کے علاقے میں سمندری پانی سے تیار شدہ نمک ملتا ہے۔

(۶) کرومائٹ :

یہ کچی دھات کی صورت میں ملتا ہے اور اس کی کانیں مسلم باغ، چاغی، خاران، وزیرستان، پاراچنار اور ہزارہ میں ہیں۔ اسے فولاد بنانے، رنگ سازی اور فوٹو گرافی کی صنعت میں استعمال کیا جاتا ہے۔

(۷) سنگ مرمر :

یہ ہمارے یہاں کئی رنگوں مثلاً سیاہ، لال، گلابی رنگوں میں ملتا ہے۔ ہمارے صوبہ بلوچستان

میں سبز اور ملے جلے رنگوں کا سنگ مرمر دستیاب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ معدنی دولت ہمیں مردان سوات ڈیرہ ہزارہ اور ضلع اٹک سے ملتی ہے ہمیں کو اس کی برآمد سے کافی زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔

(۸) جپسم :

یہ سفید رنگ کا چمکدار پتھر ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں یہ اضلاع جہلم' میانوالی' ڈیرہ غازی خاں کوئٹہ' سبی اور کوہاٹ میں ملتا ہے اس کے کچھ ذخائر بہاولپور دادو اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں وغیرہ میں بھی ہیں۔

جپسم کو سیمنٹ' کیمیائی کھاد اور پلاسٹر آف پیرس بنانے کے علاوہ مختلف چھوٹی صنعتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

(۹) تانبا :

اس کے ذخائر صوبہ بلوچستان اور صوبہ سرحد کے مقامات پر ملے ہیں۔ بلوچستان میں ضلع چاغی میں سینڈک اور اسوی مقامات کے ذخائر خاصے اہم ہیں۔ اس دھات سے برتنوں کے علاوہ اب بجلی کی مصنوعات خصوصاً تاریں وغیرہ تیار ہوتی ہیں۔

(۱۰) چونے کا پتھر :

یہ واہ' ڈنڈوت' داؤد خیل' روہڑی حیدر آباد اور کراچی وغیرہ میں ملتا ہے۔ اس کو سیمنٹ چینی کے برتن اور دوسری صنعتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

(۱۱) آتشیں مٹی :

اس کے ذخائر کوہستان نمک اور کالا چٹا پہاڑ میں پائے جاتے ہیں۔ اس سے وہ اینٹیں بنتی ہیں جو فولاد پگھلانے کی بھٹیاں بنانے میں استعمال ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ چینی کے ظروف کی مٹی بھی' جو ذخائر ہمارے یہاں موجود ہیں وہ سوات 'ہزارہ اور مالاکنڈ کے علاقوں میں ہیں۔

(۱۲) گندھک :

اس کے ذخائر زیادہ تر بلوچستان میں واقع ہیں۔ جیکب آباد اور مردان کے ضلعوں میں بھی گندھک نکلتی ہے اس کو کیمیائی اور صنعتی استعمال میں لایا جاتا ہے۔

ثقافت کی تعریف

کلچر انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی کسی شئے یا کسی ذات کی جسمانی اور ذہنی نشوونما' ترمیم و اصلاح کے ہیں۔ عام طور پر اس میں انسان کی ذاتی اور اجتماعی نشوونما کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ اردو میں کلچر کے متبادل اور مساوی اصطلاح "ثقافت" استعمال ہوتی رہتی ہے۔ اور ثقافت کو معاشرے کی ایک ایسی کتاب کا درجہ دیا گیا ہے۔ جس میں معاشرتی زندگی کو سلیس پایا جاتا ہے لوگوں کے رہن سہن کا اندازہ' لوگوں کے رسم و رواج پیشے' زبانیں' مسائل' لباس' مکانوں کے ڈیزائن اور دوسرے معاشرتی حالات سب کچھ ثقافت میں شامل ہیں۔

ثقافت کسی ایک فعل یا ادارے کا نام نہیں' بلکہ اس کا تعلق معاشرتی اداروں' گروہوں' اقدار' عقائد' رسم و رواج' سائنس آرٹ وغیرہ میں باہمی ترکیب سے ہے اور اسی لحاظ سے ثقافت کسی قوم کی شناخت بنتی ہے۔ یہی ثقافت یا کلچر وہ قدر مشترک ہوتا ہے جس سے نہ صرف کسی قوم کی پہچان ہوتی ہے بلکہ قوم کو ایک اکائی ہونے کی حیثیت بھی حاصل ہوتی ہے۔

مختلف مفکرین نے اپنے اپنے الفاظ میں کلچر کی تعریف کی ہے۔

اور اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کو اجاگر بھی کیا ہے۔ مثلاً ایف ای میرل نے لکھا ہے کہ کلچر سماجی تفاعل کی پیداوار ہے اور اپنی بقاء کے لیے اس کا انحصار معاشرے کی بقاء پر ہے۔ ایک مفکر ٹائلر نے کلچر کے عناصر گناتے ہوئے واضح کیا ہے کہ ان کا اکتساب فرد کے لیے معاشرے کا رکن ہونے کے بعد ضروری ہوتا ہے۔

مختلف علاقوں کے کلچر مل کر قومی کلچر کی حیثیت حاصل کرتے ہیں۔ چھوٹے بڑے علاقائی کلچر معاشرتی اکائیاں بن کر اٹھتے ہیں اور پھر قومی سطح پر ایک اکائی بن جاتے ہیں۔

علاقائی کلچر کے پس منظر پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت بہ آسانی واضح ہو جاتی ہے کہ فرد اپنے علاقہ کے رہن سہن، رسم و رواج اور نظریات و عقائد کے تحت اپنی زندگی کا رخ متعین کرتا ہے۔ جس علاقہ میں وہ پھلتا پھولتا ہے وہاں وہ علاقائی تقاضوں کے عین مطابق بعض ایسے افعال سرانجام دیتا رہتا ہے جو اس کے اس ارادے سے تعلق رکھتے ہوں کہ اسے بہرحال ان افعال کو انجام دینا ہے۔ یہ ارادی افعال وہ علاقائی کلچر سے ہم آہنگ رہنے کے لئے انجام دیتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ کتنے ہی افعال ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کو وہ کسی علاقہ کے زیر اثر غیر ارادی طور پر انجام دیتا نظر آتا ہے۔ وہ ایسے غیر ارادی افعال کو جس جذبہ کے ساتھ انجام دیتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ اس کے علاقے کے لوگ اسے ثقافتی اقدار میں پنپتے جانیں اور اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں۔

مثال کے طور پر سندھ میں رہنے والوں کے لئے اجرک لباس کا جزو ہے کہ جسے ارادی طور پر اپنانا پڑتا ہے لیکن اگر اسی جزو لباس کو سندھ کا کوئی باشندہ اپنے علاقائی تشخص کے جذبات کے تحت اسے بیرون ملک بھی استعمال کرتا نظر آئے تو اس کے فعل میں اس کے ارادے سے زیادہ اس کے ثقافتی جذبہ کو دخل ہو گا اور یوں اس کے یہ دونوں افعال کہ جو ارادی و غیر ارادی ہوتے ہیں اس کی ثقافتی سرگرمیوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہی چھوٹی چھوٹی ثقافتیں قومی سطح پر ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ ہوتی رہتی ہیں کہ قومی کلچر کی اکائی وجود میں آتی رہتی ہے۔

وادئ سندھ کی تہذیب اور اس کے اثرات

برصغیر جنوبی ایشیاء کے جس خطے پر پاکستان قائم ہے۔ یہاں زمانہ قدیم سے مختلف قومیں اور نسلیں آکر آباد ہوتی رہیں۔ ان میں آریا، عرب، ترک، اور منگول یکے بعد دیگرے آئے اور رفتہ رفتہ ان کی نسلوں کا باہم اشتراک ہوتا رہا۔ تاریخی لحاظ سے قدیم ترین معاشرت کے آثار خطہ پوٹھوار میں ملتے ہیں۔ یہاں دریائے سوان کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر پتھر کے ایسے اوزار برآمد ہوئے ہیں جن کے بابت ماہرین کا خیال ہے کہ یہ کم از کم دو لاکھ سے پہلے کے بنے ہوئے ہیں ان کے بارے میں ابھی تک مزید حقائق کا پتہ نہیں چل سکا۔ البتہ اس خطہ پر ایک بہت بڑی آبادی اور منظم معاشرت کے باقیات وادی سندھ میں موہنجوداڑو (ضلع لاڑکانہ) اور ہڑپہ (ضلع ساہیوال) میں دریافت ہوئے ہیں موہنجوداڑو کے بارے میں ماہرین کا خیال ہے کہ یہ شہر اپنے وقت میں یعنی تین چار ہزار سال پہلے نہ صرف ایک منصوبے کے تحت تعمیر ہوا تھا بلکہ آبادی کے لحاظ سے بھی دنیا کا پہلا بڑا شہر تھا۔ وادی سندھ کی یہ تہذیب بڑی منظم اور منفرد تھی۔

موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی دریافت سے مزید جن امور کا پتہ چلتا ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) اندازہ ہوتا ہی کہ یہ شہری تہذیب تھی شہر وسیع اور گنجان تھے۔ گلیاں کشادہ تھیں۔ صفائی کا اہتمام رہتا تھا۔ گلیوں میں پانی کی نکاسی کے لئے نالیاں نالیاں موجود تھیں۔ شہری عمارتوں میں پختہ اینٹیں استعمال ہوتی تھیں۔ گھروں میں روشنی و ہوا کا انتظام رکھا جاتا تھا۔

(۲) وہ گھریلو استعمال میں برتن بھی استعمال کرتے تھے اور مختلف قسم کے آلے اور ہتھیار بھی عام تھے۔

(۳) ان لوگوں کا محبوب پیشہ زراعت تھا۔ ایک عورت مجسمہ سے قیاس کیا گیا ہے کہ ان کے نقطہ نظر سے زمین کی زرخیزی کا سبب دھرتی ماتا تھی۔ یہ لوگ تجارت سے بھی آشنا تھے اور زیورات وغیرہ کا استعمال بھی کرتے تھے یہ آلات بہرحال جنگ کی نوعیت کے نہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ امن پسند لوگ تھے۔

(۴) مذہبی اعتبار سے یہ بت پرست لوگ تھے اور مظاہر قدرت کی بھی پوجا کرتے تھے۔ ان کے اپنے مذہبی عقائد اور تصورات تھے مثلاً ان مہروں پر کہ جو یہاں دستیاب ہوئی ہیں بعض ایسی تصویریں بھی کندہ ہیں کہ جو دیوی یا دیوتاؤں کی پرستش کی نشاندہی کرتی ہیں۔

(۵) حاصل شدہ مہروں سے اس امر کی نشاندہی بھی ہوتی ہے کہ اس زمانہ کے افراد میں لکھنے پڑھنے کا رواج بھی موجود تھا۔

(۶) حاصل شدہ نوادرات کی روشنی میں یہاں ایک منظم معاشی نظام کی موجودگی بھی قرین قیاس ہے۔ زرعی کاروبار میں اناج کے گودام کی تعمیر ضروری خیال کی جاتی تھی اور معیشت کی بہتری کے لئے ذرائع آمدورفت کے بطور جانوروں کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔

گندھارا آرٹ:

پنجاب اور سرحد کے وہ علاقے جو اس وقت راولپنڈی اور پشاور کے گرد و نواح میں واقع ہیں۔ زمانہ قدیم میں "گندھارا" کہا جاتا تھا۔ پتہ چلتا ہے کہ آج سے دو ڈھائی ہزار سال پہلے

ہی ایک بلند پایہ تہذیب گذر چکی تھی جس کے فنون لطیفہ خصوصاً سنگ تراشی کو دیکھ کر ساری دنیا حیرمین رہ گئی ہے۔

اس علاقہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ کچھ عرصہ تک پہلے ایران اور پھر یونان کے زیر اثر رہا' اس لیے ہندی' ایرانی' اور یونانی تہذیبوں نے مل کر یہاں ایک ایسی عظیم تہذیب کو جنم دیا جس میں ساری متمدن دنیا کی خصوصیات یکجا ہوئیں اور اس کا ثقافتی مرکز ٹیکسلا ٹھہرا:

گندھارا آرٹ بدھوں کے مہایان فرقہ کی کاوشوں کا نتیجہ کہلاتا ہے اور گندھارا آرٹ کے بطور مجسمہ سازی کے آرٹ پر یونانی اثرات کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اس آرٹ کے یہ دو رخ اپنی جگہ منفرد نظر آتے ہیں کہ اس کے خیالات اور نظریات مقامی ہین مثلاً گوتم بدھ کی زندگی اور اس کا مراقبہ۔ مگر جس انداز کو اختیار کیا گیا ہے وہ یونانی ہے۔ جو نظریہ اور خیال پتھر سے تراشا گیا ہے اس کا انداز اس کی ساخت اور آرائش وغیرہ پر ایرانی اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔

یہاں کی مذہبی تعمیرات بھی اسی آرٹ کا ایک پہلو ہیں۔ بودھ مردوں کی راکھ کو دفن کرکے اسٹوپا بنائے گئے اور ان کو ایک خاص انداز سے مزئین کیا گیا۔

دوسری طرف خانقاہوں کو محلات کی شکل دی گئی ہے۔ یہ پہاڑوں کی سرسبز و شاداب چوٹیوں پر تعمیر کئے گئے ہیں۔

ٹیکسلا کے آثار واضح کرتے ہیں کہ یہ شہر علم و فن کا مرکز بھی رہا۔ یہاں کی درسگاہوں نے معیار کے لحاظ سے ایسا نام پایا کہ دیگر ممالک کے طلباء بھی یہاں آئے۔

پاکستان کا ثقافتی ورثہ (پس منظر اور اثرات)

اس سوال کے جواب کا تقاضہ ہے کہ پہلے بجائے خود "ثقافت" کی وضاحت کردی جائے۔ اردو میں یہ "اصطلاح کلچر" کے مترادف موج ہے اور اس تعلق سے ثقافت کو بھی اسی قدر وسعت بہ لحاظ مفہوم حاصل ہے جس قدر وسیع معنوں میں "کلچر" کی اصطلاح زیر استعمال رہی ہے۔

کلچر یا ثقافت کی تعریف مختلف مفکرین نے اپنے اپنے الفاظ میں پیش کی ہے مثلاً ایف ای میرل نے لکھا ہے۔

"ثقافت سماجی تفاعل کی پیداوار کو کہتے ہیں اور یہ معاشرے سے اس طرح ساتھ ساتھ چلتی

پاکستان کے کلچر کے خدوخال

اس اعتبار سے ثقافت علوم' طرز معاشرت' عام معاملات زندگی اور فنون و قوانین غرضیکہ تمام ارادی و غیر ارادی افعال کا مجموعہ ہوتی ہے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی ثقافت کو ہمیشہ سے ایک علیحدہ تشخص حاصل رہا ہے۔ دراصل ثقافت کی یہ جداگانہ نوعیت ہی تھی کہ جس نے دو قومی نظریہ کو راہ دی۔ مملکت پاکستان وجود میں آئی۔

پاکستان وجود میں آیا تو بلاشبہ اسے مختلف علاقائی ثقافتیں بھی ورثہ میں ملیں۔ اور چونکہ یہ ملک نظریاتی طور پر وجود میں آیا تھا اس لئے ایک ایسے مشترک کلچر کو وجود میں لانا بھی ضروری ٹھہرا جو بنیادی طور پر اسلامی تہذیب و اقدار و مزاج کا آئینہ دار ہو۔

ایک اہم بات کہ جس کی وضاحت اس مرحلہ پر ست اہم ٹھہرتی ہے یہ ہے کہ کسی قومی ثقافت کے ظہور سلسلہ میں شعوری کوشش کے بطور صرف سمت کا تو تعین ضرور کرنا پڑتا ہے جب کہ ذیلی ثقافتیں از خود ایک دوسرے سے قریب تر آتی رہتی ہیں اور ایا۔ قومی ثقافت کا اسٹرکچر تیار ہوتا رہتا ہے چنانچہ یہی صورت حال پاکستانی کلچر کے سلسلہ میں بھی سامنے آئی۔
پاکستانی کلچر کے ان بنیادی اصولوں کے تعین کے بعد کہ :

(i) ہماری ثقافت اسلامی اور صاف و پاک ہو

(ii) مذہبی رواداری ہماری ثقافت کا اہم جزو ہو

(iii) ہماری معاشرتی زندگی کی بنیاد اسلام پر ہو

(iv) ہمارے یہاں معاشرتی ہم آہنگی اتحاد کا ذریعہ ہو

(v) ہمارے ادب شاعری اور فنون لطیفہ کا اپنا مزاج ہو جس میں ایک صحت مندانہ رجحان غالب ہو

(vi) ہرچند علاقائی معیشت و لباس و زبان میں اختلاف سہی' اسلامی اقدار سب میں یکساں ہو۔

پاکستانی کلچر نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے منفرد خدوخال کے ساتھ اپنا جداگانہ تشخص حاصل کرنا شروع کردیا۔ اور یوں جو ثقافت "پاکستانی کلچر" کے بطور وجود میں آئی اس کے خدوخال یہ تھے :

(۱) اسلامی طرز حیات و طرز معاشرت

قائد اعظم کے بقول جنوبی ایشیا میں پاکستان تو اسی وقت بن گیا تھا جب یہاں پہلا غیر مسلم، مسلمان ہوا تھا۔ بلحاظ تاریخ میں بہرحال اسلام کی تبلیغ و اشاعت اس وقت سے شروع ہوئی جب محمود غزنوی نے پنجاب کے علاقہ کو غزنی کی حکومت کا حصہ بنایا۔ محمود غزنوی بعد افغانستان ایران ترکستان سے ان حکمرانوں اور امیروں اور عالموں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسلمانوں کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا چنانچہ اسلامی تعلیمات، اسلامی اقدار اور اسلامی طور طریقے پاکستان میں زمانہ قدیم سے موجود تھے۔ پاکستان بننے کے بعد یہ طرز حیات اور طرز معاشرت قومی ثقافت کے بطور فروغ پانے لگے آج یہ سب کچھ پاکستان کے لوگوں میں اس قدر رچا بسا ہوا ہے کہ یہی اس قوم کو برصغیر کی دوسری اقوام سے بہتر اور ممتاز کرتا ہے۔

(۲) علاقائی اور قومی ثقافت کا متوازی انداز

پاکستانی ثقافت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ یہاں علاقائی اور قومی ثقافت بغیر کسی تصادم کے ایک دوسرے کے متوازی چلتی ہیں۔ ان میں کسی باہمی تصادم کا خطرہ اس لئے نہیں کہ ہر دو ثقافتوں میں ایک دوسرے کے عناصر قبول کرنے کی لچک موجود ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شادی بیاہ وغیرہ کی کتنی ہی ایسی رسمیں جو خصوصی طور پر کسی علاقے سے تعلق رکھتی ہیں اور کچھ ثقافتی پہلو (مثلاً اردو زبان) ایسے ہیں کہ جو وسطی ایشیا سے آنے والے مسلمانوں اور مقامی افراد کے میل جول سے وجود میں آئے۔ یہ سب ایک وحدت یا اکائی بن کر پاکستان کی قومی ثقافت یا کلچر کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

اردو زبان اور قومی لباس بطور خاص پاکستان کی اپنی ثقافت کے نمایاں مظہر ہیں۔ اردو زبان نے نہ صرف علاقائی زبانوں کو اپنے اندر کھپایا ہے بلکہ فکری اتحاد کو بھی تقویت دی ہے اسی طرح قومی لباس، مختلف علاقوں میں بسنے والوں کو یکساں وقار بخشا ہے۔

(۳) مغربی اثرات

پاکستانی کلچر میں جو مغربی اثرات نمایاں ہیں، بہرحال ان سے بھی انکار محال ہے۔ دراصل یہ اثرات انگریزوں کی ڈھائی سو سالہ غلامی کا نتیجہ ہیں۔ انگریز کی سیاست کا ایک خاص محور یہ تھا کہ اسلامی اقدار کو کسی طرح پنپنے کا موقع نہ دیا جائے۔ چنانچہ انگریزی تعلیم سے متعلقہ نسلوں نے جو

اثرات قبول کئے وہ کسی نہ کسی طور آج بھی ہمارے پاکستانی کلچر کا حصہ ہیں۔ اس سلسلہ میں ماہرین عمرانیات کے بطور توجہ طلب امر ہے کہ یہ اثرات وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتے رہیں اور اسلامی اقدار حیات پر غالب نہ آنے پائیں۔ مثلاً اگر آج کوٹ پتلون وغیرہ کو بطور لباس استعمال کیا جاتا ہے تو اس پر فکرمند ہونا ضروری نہیں ضرورت اس احساس کو برقرار رکھنے کی ہے کہ اصل وقار قومی لباس سے ہی ہمرشتہ ہے۔

(۴) فنون لطیفہ سے شغف

پاکستانی کلچر میں فنون لطیفہ سے گہری دلچسپی کا عنصر بھی بہت نمایاں ہے۔ علاقائی زبانوں کی شاعری کی اپنی خصوصیات میں اردو شاعری کا اپنا رنگ و آہنگ ہے جو علاقائی زبانوں کی شاعری کا حصہ بن رہا ہے اور اسی طرح علاقائی رنگ اردو شاعری کو طرح دار بنا رہے ہیں۔ ہماری قومی و علاقائی شاعری کے موضوعات میں عرفان و تصوف بڑا اہم درجہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ روحانیت کے عنصر کے ساتھ فن لطیفہ کا یہ پہلو اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ مصوری اور موسیقی کا بھی یہی معیار ہے۔ مصوری کے سلسلہ میں جنوبی ایشیا میں مسلمان بغداد کی فنی روایات ساتھ لے کر آئے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ روایات پختہ ہوتی گئیں اور عصر حاضر کے تقاضوں کا ساتھ دینے کے لئے مصوری کے فن نے تجدیدی آرٹ کو بھی قبول کیا۔

موسیقی کی روایات بھی مسلم فاتحین ساتھ لائے تھے۔ جنوبی ایشیا میں ہندو موسیقی کی جڑیں بہت مستحکم تھیں چنانچہ ہندو مسلم موسیقی کے ملاپ سے موسیقی کی ایک نئی فضا بنی جو پاکستان کے کلچر کا سرمایہ ٹھہری۔

فن تعمیرات اور صنعت و حرفت بھی پاکستانی کلچر کے نمایاں پہلو ہیں۔ تعمیرات کا فن ہماری قدیم روایت ہے اور اس کی جو اہم و منفرد خصوصیات نمایاں رہی ہیں وہ عمارتوں کا کشادہ ہونا، روشن ہونا، مختلف حصوں کا باہمی تناسب، صحیح محراب کے اصولوں پر گنبد سازی، عمودی خطوط کی ابتدا اور افقی حصے کے نشیب و فراز وغیرہ ہیں۔

(۵) اخلاقی اوصاف

اسلام کے تعلق سے پاکستانیوں کے اخلاقی اوصاف بھی قومی کلچر کے خاص مظاہر میں ان اوصاف میں دلیری، فیاضی اور دیانتداری و مساوات نمایاں طور پر شامل ہیں۔ پاکستانی قوم کو جب

بھی موقع ملتا ہے وہ ان اوصاف کے اظہار میں کامیاب اور کامران ہوتی ہے مثلاً پاک بھارت جنگوں کے موقعوں پر پاکستانی جیالوں کی بہادری تاریخ کا حصہ بنی۔ دوسرے اوصاف میں مساوات ہمدردی و رواداری وہ خوبیاں ہیں جو معاشرہ کے افراد کو دین اسلام کے ارکان کے توسط سے حاصل ہوئی ہیں۔ افراد دن رات میں پانچ بار نماز کے لئے مسجد میں یکجا ہوتے ہیں۔ اس طرح انھیں ایک دوسرے سے تعاون و محبت کے جذبات کو پروان چڑھانے کا موقع ملتا ہے جب کہ دوسری طرف یہی ارکان دین ان کو مساوات کا مظہر بناتے ہیں۔

(۶) تفریحی مشاغل پسندی

تفریحی مشاغل پسندی بھی پاکستانی کلچر کا نمایاں پہلو ہے۔ طبعی لحاظ سے قدرت نے پاکستان کو سرسبز و شاداب بنایا ہے۔ پہاڑوں، وادیوں، نہروں، باغوں اور دوسرے مظاہر قدرت نے یہاں کے افراد کو جمالیات پسندی کا رجحان دیا ہے اور اسی رجحان کی تشفی کے لئے وہ کھیلوں اور دوسرے تفریحی مشاغل مثلاً سیر و سیاحت وغیرہ میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ پاکستان میں مختلف علاقوں کے اپنے اپنے دلچسپ کھیل اور تفریحی سرگرمیاں ہیں جب کہ قومی سطح پر کرکٹ اور ہاکی سے دلچسپی عام ہے۔

(۷) اجتماعیت پسندی

پاکستانی قوم کے کلچر کا ایک اور اہم پہلو اس کی اجتماعیت پسندی ہے۔ یہ اجتماعیت پسندی کبھی میلوں، تہواروں، میلاد و مجلس وغیرہ کی صورت میں سامنے آتی ہے اور کبھی اعراس اور دوسرے مذہبی و روحانی اجتماعات کے بطور اجتماعیت پسندی کے رجحان کی تشفی کا سبب بنتی ہے۔ اجتماعیت پسندی کی ان تمام صورتوں سے بھی بہرحال معاشرتی روابط کو فروغ ملتا ہے اور اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

ہے کہ اس کی اپنی بقا کا انحصار معاشرے کی بقا پر ہوتا ہے۔"

ایک اور ماہر عمرانیات ای بی ٹائلر نے لکھا ہے۔

"ثقافت وہ مرکب ہے جس میں علم، عقائد، فن، اخلاق، قانون اور رسوم اور دوسری تمام صلاحیتیں اور عادتیں شامل ہوتی ہیں اور فرد فن جن کا اکتساب معاشرے کے رکن کے بطور کرتا ہے۔"

ان دونوں تعریفوں کو بیک وقت زیر غور لایا جائے تو اساسی اور بنیادی نقطہ "سماج" ہی بنتا ہے۔ میل نے اپنی بات براہ راست سماجی تفاعل سے شروع کی ہے جب کہ ٹائلر نے سماج کے ان اجزاء اتصال (ملاپ) کی بات کی ہے جن کا ایک انسان بطور سماجی رکن اکتساب کرتا رہتا ہے۔ پس "ثقافت" "سماج" کے نقطہ کا ہی پھیلاؤ ہے اور اس کی وسعت کا اندازہ اس طرح بھی بخوبی ممکن ہے کہ اس میں مذہبی اقدار، رہن سہن، زبان و ادب، روایات و اقدار، سب ہی کچھ آجاتے ہیں۔ ان سب کا مجموعہ ہی "ثقافتی ورثہ" بنتا ہے اور پھر جب سماج یا معاشرہ نسل در نسل آگے بڑھتا ہے تو یہ "ثقافتی ورثہ" بھی ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہتا ہے۔

اس ضروری تمہید کے بعد پاکستانی ثقافت کی طرف آتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر میں ہزاروں برس پہلے سے اپنی ایک سماجی زندگی رواں دواں رہی ہے، اس کے اپنے رسم و رواج رہے ہیں، اپنے مختلف النوع عقائد رہے ہیں، رہن سہن کے طریقے رہے ہیں اور زبان و لباس رہے ہیں اور تقسیم برصغیر کے بعد جو حصے پاکستان بنے ہیں ان کا اپنا اتصال (ملاپ) پاکستانی ثقافت کا نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس مرحلہ تک پہنچنے کے بعد قبل اس کے کہ ہم پاکستانی ثقافتی ورثہ کو تاریخی ارتقاء کے ساتھ پیش کریں اس امر کی وضاحت بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ دوسرے تمام معاشروں کی طرح ہمارے معاشرے میں بھی چھوٹی سطح کی ثقافتیں موجود رہی ہیں۔ لیکن جہاں قومی ثقافت کی نشان دہی کی گئی ہے وہاں ان تمام ذیلی ثقافتوں کو ہم آہنگ کرکے پیش کیا گیا ہے اور پھر وہی کلچرل یا ثقافتی اکائی ہماری قومی شناخت ٹھہری ہے۔

پاکستانی ثقافتی ورثہ کا ارتقاء (تاریخ کی روشنی میں)

(۱) عقائد اور نظریات کا ارتقاء

موہنجوداڑو اور ٹیکسلا کی تہذیب سے لے کر آج تک پاکستانی معاشرہ علاقائی سطحوں پر اپنی اپنی اقدار حیات کا پابند رہا ہے۔ ان میں جس قدر مشترک نے فروغ پایا ہے وہ نظریہ و عقیدہ کی قدر ہے اور وہ قدر کہ جس نے دوسری تمام ذیلی اقدار کو ثانوی درجہ دے کر نوحہ اساسی مرتبہ حاصل کیا ہے وہ اسلامی قدر حیات ہے۔ قیام پاکستان کے بعد قومی ثقافت کے بطور اسی قدر نے فروغ پایا ہے اور مذہبی رواداری اور اسلامی تہذیب کو معاشرہ کا مشترکہ عنصر بننے کا موقعہ ملا ہے۔

(۲) عرفان و تصوف کے رجحانات کا ارتقاء

اسلامی اقدار حیات کے حوالہ سے ہی ہماری قومی ثقافت کے بطور عرفان و تصوف کے رجحانات بھی وراثت میں ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوئے ہیں۔ ہماری ہر ذیلی ثقافت میں یہ عنصر کسی نہ کسی انداز سے نمایاں رہا ہے۔ مثلاً سندھ میں شاہ لطیف بھٹائیؒ نے اسے عوامی زندگی کا حصہ بنایا ہے اور پنجاب میں بھلے شاہؒ نے ارتقائی طور پر آج عرفان و تصوف ہماری قومی ثقافت کی ایک نمایاں خوبی ہے اور یہ عنصر آج اس قدر توانا اور مستحکم ہے کہ آنے والی نسلوں کو اس کی ترسیل یقینی امر ہے۔

(۳) شاعری، مصوری، موسیقی و خطاطی کی روایات کا ارتقاء

بعض اہم فنون لطیفہ مثلاً شاعری، موسیقی، اور خطاطی ہمارا عظیم ثقافتی ورثہ رہے ہیں۔ ذیلی سطحوں پر ان کا اپنا ارتقاء رہا ہے اور قومی سطح پر ذیلی ثقافتوں کے اشتراک سے انہیں ایک مجموعی صورت بھی حاصل ہوئی ہے۔ علاقائی شاعروں کے یہاں تصوف، صلح و القائے، [illegible]، اور محبت و اتحاد کے موضوعات مشترک رہے ہیں اور یہی پاکستان کی قومی شاعری کا جزو ٹھہرے ہیں۔

مصوری کے سلسلے میں تاریخ گواہ ہے کہ جنوبی ایشیا میں مسلمان بغداد کی فنی روایات لے کر آئے تھے شروع شروع میں محلات اور دیگر عمارتوں کی دیواروں اور چھتوں پر آرائشی تصاویر و نقش و نگار بنائے گئے اور پھر رفتہ رفتہ یہ روایات اور پختہ ہوتی گئیں۔ قومی سطح پر مصوری کی روایت میں عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق "تجریدی آرٹ" کا اضافہ بھی ہوا۔

مسلم فاتحین موسیقی کی روایات بھی ساتھ لائے تھے۔ جنوبی ایشیا میں ہندو موسیقی کی جڑیں بہت پختہ تھیں چنانچہ ہندو مسلم موسیقی کے ملاپ سے موسیقی کی ایک نئی فضا بنی۔ وہ ہمارا قومی ثقافتی ورثہ ٹھہری اور پھر نسل در نسل منتقل ہوتی رہی۔ مسلم فنکاروں نے نئے ساز اور نئے

راگ ایجاد کیے۔ حضرت امیر خسرو مسلم عہد کے اولین عظیم موسیقار ٹھہرے۔

خطاطی کا ثقافتی اضافہ بطور خاص مسلم عہد سے ہوا۔ مسلمان خطاطی میں بطور خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ قرآن پاک سے ان کی قلبی محبت تھی اس فن سے مسلمانوں کی وابستگی کا عالم یہ تھا کہ مسلم معاشرے میں اس وقت تک کسی کو خواندہ اور مہذب خیال ہی نہیں کیا جاتا تھا جب تک وہ خوش نویس نہ ہو۔

(۴) فن تعمیر و صنعت و حرفت کا ارتقاء

فن تعمیر اور صنعت و حرفت بھی ارتقائی انداز میں ہماری قومی ثقافت کا حصہ بنتے رہے۔ تعمیرات میں تاریخی لحاظ سے پاکستان کا ثقافتی ورثہ بہت پرشکوہ ہے۔ جامع مسجد ٹھٹھہ، لاہور کی شاہی مسجد، شاہی قلعہ، شالامار باغ، مغل بادشاہوں کے اعلیٰ معیار تعمیر کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ پھر خطہ سندھ میں دریافت ہونے والی قدیم تہذیب واضح کرتی ہے کہ اس خطے کے رہنے والوں نے دھاتوں سے برتن، زیورات اور آلات بنانے کا فن پانچ چھ ہزار سال پہلے ہی سیکھ لیا تھا۔ ہمارے یہاں کے مقبرے سنگ تراشی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ مسلم فن تعمیر کی اپنی منفرد خصوصیات ہیں۔ ان خصوصیات میں عمارتوں کا کشادہ ہونا، روشن ہونا، مختلف حصوں کا باہمی تناسب، صحیح محراب کے اصولوں پر گنبد سازی عمودی خطوط کی ابتدا اور افقی حصے کے نشیب و فراز کا حسن شامل ہیں۔

(۵) تفریحات و مشاغل، تہوار و میلے وغیرہ کا ارتقاء

پاکستان میں ذیلی ثقافتی سطحوں کے جوہر مختلف تفریحات اور مشاغل جاری رہے ہیں۔ وہ سب قومی ثقافت کا حصہ بنے ہیں۔ علاقائی کھیلوں میں کشتی، ملاکھڑا وغیرہ موجود ہیں جب کہ قومی سطح پر کرکٹ اور ہاکی نے فروغ پایا ہے اور یہ مشاغل نسل در نسل منتقل ہوتے رہے ہیں۔

تہوار اور میلوں نے بھی بحیثیت مجموعی ہماری قومی ثقافت کو رنگ و آہنگ دیئے ہیں۔ عید الفطر اور عید الاضحی دو بڑے تہوار ہیں جن کو ہر علاقائی سطح پر اہمیت حاصل ہے اور ان تہواروں کی روایتی خوشیاں ہمیں سال بھر اپنا منتظر بنائے رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ عید میلاد النبی کا تہوار قومی نقطہ نگاہ سے رحمتوں کے نزول کا دن ہوتا ہے۔

صوفیائے کرام کے اعراس اور میلے بھی شان و شوکت سے منائے جاتے ہیں اور یہ ثقافتی ورثہ اپنی تمام تر آن و بان کے ساتھ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہا ہے۔

(٦) لباس و زبان کے عناصر کا ارتقاء

تاریخی نقطہ نظر سے پاکستان کی ثقافت میں بغرض لباس اور زبان کو بھی بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ علاقائی سطحوں پر جو لباس رائج رہا ہے اس میں شلوار، قمیض، پگڑی اور ٹوپی مشترک رہے ہیں۔ ان ہی کی بنیاد پر قمیض و شلوار کو قومی لباس کا درجہ دیا گیا ہے۔

علاقائی سطحوں پر جو زبانیں موج رہی ہیں پاکستان کی قومی زبان اردو نے ان سب کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ و ہم رشتہ کردیا ہے۔ قومی زبان نے ان سب علاقائی زبانوں کے الفاظ و خیالات کو اپنے اندر سمولیا ہے۔ اسی لئے قومی زبان اردو کراچی سے خیبر تک بہ آسانی سمجھی و بولی جاتی ہے اور ہماری قومی ثقافت کا عظیم سرمایہ بن گئی ہے۔

ایشیاء میں مسلم عہد حکومت کے دوران فن تعمیر:

کسی قوم کا فن تعمیر اس کے ذوق اور طبع رجحانات کا مظہر ہوتا ہے۔ مسلم فن تعمیر بھی اس لحاظ سے اپنی منفرد خصوصیات رکھتا تھا ان میں پہلی خصوصیت یہ تھی کہ یہ عمارتیں کشادہ وسیع اور روشن ہوتی تھیں۔ بلاشبہ اس کا پس منظر یہ تھا کہ خود دین اسلام کشادگی اور وسیع النظری کا پیغام دیتا ہے۔ دوسری خصوصیت ان عمارتوں کے مختلف حصوں کے باہمی تناسب کا لحاظ تھا۔ غیر ضروری آرائش سے گریز کرتے ہوئے توجہ اس پر مرکوز کی جاتی تھی کہ مجموعی عمارت خوش منظر نظر آئے۔

اس سلسلہ کی تیسری اور چوتھی خصوصیات بالترتیب صحیح محراب کے اصولوں پر صحیح گنبد سازی اور عمودی خطوط کا رواج تھا۔ مسلم عمارتوں کے گنبد انتہائی خوبصورت تھے اور میناروں وغیرہ کی لکیریں نیچے سے اوپر تک سمت عمارت کے وقار کو نمایاں کرتی تھیں ان عمارتوں کی پانچویں خصوصیت یہ تھی کہ افقی حصے کا نشیب و فراز ان عمارتوں کے حسن کو دوبالا کرتا تھا۔

مسلم فن تعمیر کتنے ہی شاہکار آج بھی مذکورہ بالا خصوصیات کے ساتھ ہمیں اپنی عظمت کا قائل بناتے ہیں۔ ان شاہکار عمارات میں مقبرہ جانگیر لاہور، قلعہ آگرہ، تاج محل، بادشاہی مسجد لاہور، مسجد لیاقت علی خاں پشاور، وغیرہ شامل ہیں۔

اس حقیقت کی روشنی میں کہ ثقافت علوم، طرز معاشرت، عام معاملات زندگی، فنون و ہنر اور قوانین غرض تمام ارادی غیر ارادی افعال کا مجموعہ ہوتی ہے۔ جنوب ایشیاء میں اسلامی ثقافت ہندو ثقافت سے قطعی مختلف نظر آتی ہے۔

اس کی بنیادی وجہ بلاشبہ یہ ہے کہ اسلام کے ایک باضابطہ نظام حیات لے کر آیا اور اس نے ملت اسلامیہ کے لئے معاشرے اور زندگی کے یکساں اصول فراہم کئے جب کہ ہندو قوم مختلف نظریاتی ٹکراؤ سے ٹوٹتی پھوٹتی رہی اور ثقافت کا کوئی ایک واضح تصور کبھی اس قوم میں قائم نہیں ہوسکا۔

عقائد و نظریات کے اعتبار سے ہر دو ثقافتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے مسلمان ایک اللہ، ایک رسولؐ اور ایک قرآن کے پرستار ہیں جب کہ ہندو ان گنت خود ساختہ دیوتاؤں کی پرستش میں الجھے ہوئے ہیں۔ قرآن مسلمانوں کو حکیم مثالی ضابطہ حیات فراہم کرتا ہے اور ہندو قوم کا امن ایسے کسی دستور حیات سے خالی ہے حق و باطل کا یہ فرق دونوں کی ثقافتوں کو ایک دوسرے کے برعکس ٹھہراتا ہے۔

ہائے حیات میں بھی ثقافتی اختلافات کی سی صورت حال ہے۔ مثلاً فن تعمیر کو دیکھا جائے تو مسلم عمارتوں کی کشادگی اسلام کی اپنی وسیع النظری کی عکاسی ہے جبکہ ہندو عمارات تنگ و تاریکی اس قوم کی محدود ذہنیت کا پتہ دیتی ہے۔ مسلمانوں کی عمارات پائیدار ہیں اگرچہ سوئیٹ اور پتھر وغیرہ ہی استعمال کیا گیا ہے لیکن محراب کی گولائی نے ان کو زیادہ پختگی دی ہے جب ہندو قوم خراب کی گولائی سے قطعی نابلد تھے مسلمانوں کی عمارتیں سادگی کے ساتھ دلکشی کا شاہکار ہیں جب کہ ہندو طرز تعمیر میں رنگوں کی بھرمار ہے۔ یہی حال مصوری کا ہے رنگوں کا حسین امتزاج مسلمانوں کے ذوق سلیم کا پتہ دیتا ہے اس فن میں حقیقت نگاری مسلمانوں کا اپنی نئی کمال ہے و ... فن خطاطی وغیرہ کے فن میں ہے کہ جس کا ہندو ثقافت میں کیسی کوئی عنصر نظر نہیں آتا۔

مسلمانوں کے لباس زبان اور رسم و رواج سب کچھ ہی ہندو قوم سے مختلف نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کے ان ثقافتی پہلوؤں میں ایک مقصد کارفرما ہے جب کہ ہندو ثقافت کے یہ پہلو کورانہ تقلید کا نمونہ ہیں۔ چنانچہ ہر اعتبار مسلمانوں کی ثقافتی روایات منفرد و مثالی ہیں۔

اردو زبان کی قومی زندگی میں اہمیت

ملکی اور قومی لحاظ سے اردو کو خاص حیثیت حاصل ہے۔ ملکی دستور میں اسے قومی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اور اسے یہ درجہ جن حقائق کی روشنی میں حاصل ہوا وہ یہ تھے کہ نہ صرف علاقائی زبانوں پر فوقیت کی مستحق تھی بلکہ اس میں دوسرے متعدد صوبوں اور علاقوں کو متحد رکھنے کی بھی صلاحیت موجود تھی۔ یہی اردو زبان کی اہمیت کے خاص رخ تھے۔

اردو چونکہ کسی علاقے کی مخصوص زبان نہ تھی اس لیے اسے پاکستان میں ایک مشترکہ زبان کا منصب حاصل ہوا۔ اور وہ قومی یکجہتی اور اتحاد میں معاون ثابت ہوئی۔ اسی کے ذریعے بین الصوبائی اتحاد بڑھا اور قومی وقار میں اضافہ ہوا۔ علاقائی زبانیں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھیں چنانچہ اردو ہی نے معاشرتی ہم آہنگی پیدا کرنے کا کام انجام دیا اور خود کو تمام علاقوں کے ادب کا مجموعی آئینہ بنایا۔ اس وسیلے سے خود علاقائی زبانوں میں اشتراک باہمی پیدا ہوا اور اردو قومی تشخص کی علامت ٹھہری۔

قومی تشخص کی علامت کے بطور اردو کو عالمی سطح پر ہردل عزیزی اور مقبولیت حاصل کرنا ممکن ہوا۔ یہ بین الاقوامی طور پر پاکستان کے افراد کی مشترکہ زبان بنی اور یوں دنیا کے ہر حصہ میں اسے بولا بھی گیا اور سمجھا بھی گیا۔

قومی تشخص کی ایک مضبوط بنیاد اس حقیقت نے بھی فراہم کی کہ اس زبان میں اسلامی روایات و ثقافت کا ایک وسیع سرمایہ موجود ہوگا اور ہر قسم کے تاریخی ورثوں کی امین ٹھہری اور یوں اجتماعی زندگی اور ماحول کی کامیاب ترجمان قرار دی گئی۔

بعض مفکرین کا خیال ہے کہ اردو زبان کی ابتدا اس زمانہ سے ہوئی جب مسلمانوں نے سندھ فتح کیا۔ اور عربی نے سندھ کی قدیم بولی پر اثرات چھوڑے۔ لیکن ڈاکٹر ابواللیث صدیقی جیسے ماہرین لسانیات اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے ان کے خیال کے مطابق سندھی پر عربی کا اثر ضرور ہے لیکن سندھ میں اسلامی حکومت کا پہلا دور بہت مختصر تھا۔ دوسرے یہ کہ موجودہ اردو پر عربی کے جو اثرات آئے وہ براہ راست عرب سے نہیں آئے۔ اس لئے اردو ابتدا اس وقت ہوئی جب فارسی بولنے والے مسلمان اس ملک میں داخل ہوئے یعنی اردو کی ابتدا سلطان محمود غزنوی (۹۹۷ء تا ۱۰۳۰ء) اور سلطان شہاب الدین غوری کے حملوں کے زمانہ میں ہوتی ہے۔ پھر قطب الدین ایبک کے ساتھ مسلمانوں کا اثر سندھ اور پنجاب سے دہلی تک پھیل گیا۔ مسلمانوں کی زبان فارسی تھی۔ بعض لوگ ترکی بھی بولتے تھے۔ مقامی عربی فارسی اور ترکی الفاظ شامل ہوتے گئے اور پھر جب اس طرح یہ ایک زبان کی صورت اختیار کرنے لگی تو اسے ہندی یا ہندوی کہا جانے لگا۔ امیر خسرو کو ہندی کا پہلا شاعر تسلیم کیا گیا۔ پھر اسے ریختہ کا نام ملا۔ اس نام کی جگہ پھر "اردوئے معلی" نے لے لی اور یہی نام کثرت استعمال کی وجہ سے صرف "اردو" رہ گیا۔

اردو کی ترقی میں جن عوامل نے حصہ لیا ان میں پہلا عنصر اہل دکن کی کوششوں کا تھا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر گذرا۔ پھر ولی دکنی نے اردو شاعری کو سنوارا اور اس کے بعد یہ زبان دلی پہنچی۔ دہلی اور دکن کے علاوہ ریاست اودھ اور لکھنؤ نے بھی اردو کے گیسو سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں نظم اردو کے ساتھ ساتھ نثر اردو کو بھی خاص ترقی نصیب ہوئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اردو زبان کی تخلیقات نے نئی سمت پائی۔ یہ اردو زبان کے لئے غور و فکر اور مشاہدہ و تجربہ کا دور ٹھہرا۔ زبان کے ارتقاء اور فروغ کے سلسلہ میں اب مقصدیت کو اساسی حیثیت دی گئی۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے سماجی تطہیر کا بیڑا اٹھایا اور اس مقصد کے لئے اردو زبان کو صفائی اور سادگی کے قالب میں ڈھالا گیا۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء جدید اردو نثر کے عناصر خمسہ بن کر ابھرے۔ نظم و نثر دونوں پر نت نئے تجربات ہوئے۔ اور اس کے بعد یہ اپنی ترقی کا سفر زیادہ تیزی سے طے کرنے لگی۔ مولانا حالی اور علامہ اقبال کی

شاعری نے اسے فکر سے بھرپور صلاحیت عطا کی اور قیام پاکستان کے بعد اردو ادب کی ترقی میں ایک آزاد فضاء پیدا ہوئی۔ چنانچہ آج اردو زبان و ادب نے ہر اغیار سے وہ درجہ حاصل کر لیا ہے کہ وہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے پورے اعتماد کے ساتھ آنکھ ملا سکے۔

پشتو زبان (تاریخ اور اہمیت)

پشتو ہمارے صوبہ سرحد کی علاقائی زبان ہے۔ اس کی ابتداء تقریباً ۵ ہزار سال پہلے افغانستان کے علاقے باختر یا پخت میں ہوئی اسی تعلق سے اس کا نام باختو یا پختو ہوا اور بعد میں پشتو بن گیا۔

پشتو بہ لحاظ زبان بہت قدیم ہے لیکن اس کے ادب کا آغاز بہت بعد میں ہوا اور دوسری مہذب زبانوں کی طرح اس کے ادب کا آغاز بھی شاعری سے ہوا۔ ایک تحقیق کے مطابق اس زبان کی پہلی کتاب آٹھویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں لکھی گئی جس کا نام پٹہ خزانہ ہے۔ اس زبان میں نظم کا پہلا شاعر امیر کروڑ کو سمجھا جاتا ہے۔ چودھویں صدی عیسوی کے آخر تک پشتو ادب میں کافی بیرونی اثرات آ چکے تھے۔ انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشروں میں اس میں قصیدہ اور مرثیہ کی اصناف نظم بھی رواج پا چکی تھیں۔ پھر مدح کی صنف بھی اس کی شاعری کا حصہ بنی۔ محققین کو تذکرہ اولیاء نام کی ایک تصنیف بھی ملی ہے۔ جس کا سن تصنیف ۴۰۰ھ ہے۔ محمود غزنوی کے عہد میں اس زبان کے حروف تہجی تیار ہوئے جو آج تک مروج ہیں۔

پشتو کے شعری ادب کو جن باکمال اہل قلم نے مالا مال کیا ان میں اہم ترین نام خوش حال خان خٹک (۱۶۱۳ء تا ۱۶۹۴ء) کا ہے۔ ان کے کلام میں عشق حقیقی و مجازی، جنگ، بزم، تصوف، اخلاق و حریت سے موضوعات کی ترجمانی ہے۔ دوسرا اہم نام رحمان بابا کا ہے۔ یہ معرفت تو تصوف کے شاعر تھے جنھوں نے عشق حقیقی کو کائنات کی تخلیق کا باعث ٹھرایا۔ پشتو شاعری میں بعد کے شعراء نے خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا سے خاص اثرات قبول کئے۔ لوگ گیتوں کے علاوہ ٹپہ، چہ اور لنڈی اس کی اہم شعری اصناف ہیں۔

پشتو میں نثری ادب نے بیسوی صدی میں خاص ترقی پائی۔ نئے اہل قلم نے لغات، گرامر، سوانح اور افسانہ وغیرہ پر قلم اٹھایا اور اس زبان کے نثری ادب کو وسعت دی۔

پشتو زبان کے تین لہجے ہیں۔ ایک لہجہ شمال مشرق کے علاقوں کا ہے۔ دوسرا جنوب مغرب کا ہے اور تیسری زونی قبائل کا لہجہ ہے۔ ان کے مابین بنیادی فرق تلفظ کا ہے۔

سندھی زبان (تاریخ اور اہمیت)

سندھی پاکستان کی قدیم ترین زبان ہے۔ یہ زبان پراکرت سے نکلی ہے۔ جو زمانہ قدیم میں سندھ پنجاب کے جنوبی علاقے میں بولی جاتی تھی۔ مسلمان سندھ آئے تو علاقائی زبان کا عربی سے ملاپ ہوا پھر بعد میں آنے والے مسلمانوں کی زبان فارسی تھی اور وہ ترکی بھی بولتے تھے چنانچہ سندھی پر دراوڑی، سنسکرت، یونانی، ترکی، ایرانی اور دیگر کئی زبانوں کے اثرات نمایاں ہیں۔ زبان کوئی بھی ہو اس کا ارتقاء کسی مقام پر جامد نہیں ہوتا چنانچہ انگریزوں کی آمد کے بعد سندھی زبان میں بھی انگریزی زبان کے الفاظ شامل ہوئے ہیں۔

لہجے کے اعتبار سے بھی سندھی وسیع علاقہ کی زبان ہے۔ سندھ کے زیریں اور راجستھانی علاقے میں لاڑی، کچھی، کاٹھیاواڑی اور تھر کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ بلوچستان میں جو کالی، گنداوی، فکری، لاسی، لیکھی، لوری، اور جیسٹی کے لہجے مروج ہیں۔ جب کہ باقی علاقوں میں کوہستانی، سرائیکی اور چولی کی بولیاں استعمال ہیں۔

سندھی زبان کی ترقی کا آغاز سندھ میں مسلمانوں کی آمد سے نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد عربی کے ساتھ ساتھ سندھی کو بھی فروغ ملا اور اسلامی زبانوں میں سندھی ہی وہ مقامی زبان تھی جس میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا گیا۔ ۹۵۰ء سے ۳۵۰ھ تک سندھی ادب کا پہلا دور قائم رہا۔ اس دور میں ادبی اصناف، قصے، بیت، گاتھا اور دوہڑے وغیرہ تھیں۔ مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے صوفیائے کرام نے بھی سندھی شاعری کو خاص فروغ دیا۔

اٹھارہویں صدی تک شاہ عبدالطیف بھٹائی اور حضرت سچل سرمست جیسے عظیم شاعر سندھی ادب کو مالا مال کر چکے تھے۔ یہ سندھی ادب کا سنہرا دور تھا۔ شاعری کے ساتھ ہی نثری ادب میں علماء صوفیا و مبلغین کی مشترکہ کوششوں سے خاصا اضافہ ہوا۔ اس سلسلہ میں دو ممتاز مصنفین ابوالحسن سندھی اور مخدوم محمد ہاشم کے نام بہت نمایاں ہیں اس زمانہ میں آخوانہ عزیز اللہ نے قرآن کریم کا نثری ترجمہ کیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں جدید سندھی زبان کی بنیاد

رکھی گئی۔ بیسویں صدی میں بڑا معیاری رسالہ تعلیم ا کشف و توحید کے نام سے جاری ہوا۔ اخوند لطیف ایہ' وحید قریشی اور حاجی امام بخش نے ایک طرف تو تخلیقی کاوشیں برقرار رکھیں اور دوسری طرف انھوں نے سنسکرت فارسی اردو اور یورپی زبانوں سے ترجمہ کرنے کا کام شروع کیا۔ سندھی کے اہل قلم میں مرزا قلیچ بیگ کا نام سندھی ادب خدمت میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی جملہ تصانیف کی تعداد ۴۰۰ کے قریب ہے۔ عہد جدید میں افسانہ نگاری اور ادبی تحقیق کے موضوعات پر بڑا کام ہوا ہے۔ نثری لحاظ سے سندھی ادب کا دامن وسیع تر ہوا ہے۔ سندھ یونیورسٹی جام شورو میں سندھی زبان کا علیحدہ شعبہ بھی قائم ہے۔

پنجابی زبان (تاریخ اور اہمیت)

پنجابی زبان بھی اسی زبان سے نکلی ہے۔ جو زمانہ قدیم میں خطہ پنجاب میں بولی جاتی تھی۔ یعنی اس زبان کا ربط اس علاقے کی قدیم تہذیب ہڑپائی یا دڑاوڑی سے ملتا ہے۔ تاریخی و جغرافیائی تبدیلیوں کے باعث اس کے چھ بڑے لہجے ہیں۔ ماجھی' ملتانی یا سرائیکی' پوٹھوہاری' چھاچھی' دھنی اور شاہ پوری محققین کے نزدیک مختلف زمانوں میں اس کے مختلف نام استعمال ہوئے ہیں لفظ پنجابی کا استعمال بہت بعد میں شروع ہوا ہے۔ مورخ مسعودی ملتانے ملتانی کہا ہے کہ البیرونی نے اسے "الہندیہ" کہا ہے گرونانک کی زبان کو "زبان جٹاں پنجاب" کہا گیا ہے ایک زمانہ میں اسے ہندی کہا گیا ہے امیر خسرو نے اسے لاہوری زبان کہا ہے۔ آخر اسے پنجابی کا نام دینے والے حافظ برخوردار ہیں۔

پنجابی زبان کے علم و ادب کا آغاز باقاعدہ طور پر محمود غزنوی کے زمانہ نظر آتا ہے اور اس سلسلہ میں جو کام ہمارے سامنے آتا ہے وہ حضرت داتا گنج بخش" کا ہے ان کی شاعری کے موضوعات پیار محبت' تصوف اور وطن دوستی ہیں۔ پنجاب کی صوفیانہ شاعری میں شاہ حسین' سلطان باہو' بلھے شاہ اور خواجہ فرید کے نام بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ پنجابی شاعری میں داستان گوئی نے بھی خاص مقام پایا ہے۔ ان لوک داستانوں میں وارث شاہ کا قصہ ہیر رانجھا' ہاشم شاہ کا قصہ سسی پنوں' فضل شاہ کا قصہ سوہنی ماہیوال اور حافظ برخوردار کا قصہ مرزا صاحبان بہت مشہور ہیں۔ پنجابی شاعری کی دیگر اصناف سخن بھی بڑی پر اثر ہیں۔ اور زندگی کے ہر شعبہ کی ترجمان ہیں۔ ان اصناف میں وار' ڈولے' ماہیا' ڈھے' ٹپے وغیرہ شامل ہیں۔

پنجابی زبان کے اصل فروغ کا سلسلہ دراصل انیسویں صدی کی آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں شروع ہوا۔ اب اس زبان میں علمی و ادبی کاوشیں زیادہ بھرپور انداز میں سامنے آئیں۔ پنجابی زبان میں ناول' ڈرامہ' مختصر کہانی اور افسانے زیادہ تیزی سے لکھے جانے لگے۔ ۱۹۴۰ء کے بعد پنجابی زبان میں نئے نئے موضوعات نے دخل پایا اور آج اس زبان میں مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ شاہکاروں کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔

بلوچی زبان (تاریخ اور اہمیت)

بلوچی صوبہ بلوچستان کے بلوچ قبائل کی زبان ہے۔ اس زبان کا سلسلہ ایران کے شمالی علاقوں میں بولی جانے والی قدیم زبانوں سے ملتا ہے۔ بلوچ شمالی مغربی ایران سے برصغیر میں داخل ہوئے اور قدیم بلوچی زبان بھی ساتھ لائے لیکن ابتدائی زمانہ میں اسے زیادہ ترقی حاصل نہ ہو سکی۔ ۱۸۴۰ء میں ایک انگریز مسٹر لیچ نے اس کی قدیم شاعری کو روشناس کرایا۔ ۱۹۳۰ء میں پہلا بلوچی ماہنامہ شائع ہوا لیکن وہ بھی زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ اس دوران بلوچی ادب کو ترقی دینے کے لیے کچھ تنظیمیں وجود میں آئیں۔ انگریزی عہد میں قابل قدر بلوچی شاعری تخلیق ہوئی جس کے موضوعات تصوف و اخلاق ہیں۔ اس دور کے ایک نامور شاعر مست توکلی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد اردو حرف تہجی میں ترمیم و تنسیخ کے ساتھ بلوچی زبان کے لیے ایک معیاری رسم الخط بنایا گیا۔

آج پاکستان کی علاقائی زبانوں میں بلوچی زبان بھی بلحاظ اشاعت و فروغ کی دوسری علاقائی زبان سے پیچھے نہیں۔ گل خان نصیر اور آزاد جمالدینی مشہور بلوچی مصنفین ہیں جنھوں نے اس کی ترقی کے لئے مستقل بنیادوں پر خدمات انجام دی ہیں۔

علاقائی زبانوں کے ادب پر اثرات

(ا) کشمیری : ۔ کشمیری زبان بھی پاکستان کی دوسری علاقائی زبانوں کی طرح اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اور اسے بہر حال ایک معیاری اور مکمل زبان کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کے مشہور لہجے سلمانکی' بند کو' گندرو اور گاجی ہیں۔ ان میں معیاری ادبی لہجہ گندرو ہے۔ ادبی تخلیقات کے لحاظ سے کشمیری زبان کے پانچ ادوار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان میں

پہلا دور گیت سنگیت کا ہے جس میں لوگ گیت لکھے گئے۔ دوسرا شتی گیت کا ہے جس میں الہیات کو موضوع بنایا گیا۔ اس دور کے مشہور شاعر جنھیں کشمیری زبان کا پہلا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے شتی کنٹھ تھے۔ تیسرا دور عشق و محبت کی شاعری کا ہے۔ حبا خاتون اس دور کی نامور شاعرہ تھیں۔ چوتھے دور میں کشمیری ادب میں روحانی عنصر غالب ہے۔ پانچواں دور عہد جدید کا ہے۔ اس دور میں نئے فکری رجحانات ملتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ تراجم وغیرہ کے ذریعے کشمیری ادب کو وسعت دینے کی کوششیں بھی نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔ آج کشمیری زبان عام و خاص دونوں حلقوں میں مقبولیت رکھتی ہے۔ یہ ایک عام بولی بھی ہے اور اسے روزمرہ کی خط و کتابت میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس زبان کے نامور شعراء میں غنی کاشمیری وغیرہ شامل ہیں جب کہ کشمیری زبان کی بجھار میں اور پہیلیوں کے لئے شیخ نور الدین، خاتون الہ عارفہ اور بابا نصیرالدین نے بڑی شہرت پائی ہے۔

(۲) براہوی :

براہوی، وادی سندھ کی قدیم قوم دراوڑ کی زبان ہے جس کی دو واضح لہجے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پہلا لہجہ مشرقی ہے جو سندھی زبان سے قریب تر ہے اور دوسرا مغربی لہجہ ہے جس پر بلوچی اثرات نمایاں ہیں۔ دراصل یہ مخصوص لہجوں کی تقسیم ہی تھی کہ جس نے براہوی زبان کو علیحدہ سے کسی علاقائی زبان کی حیثیت حاصل نہ ہونے دی وہ لہجہ جو سندھی زبان سے قریب تر تھا۔ سندھی زبان پر تو اپنے اثرات مرتب کرتا رہا مگر علیحدہ سے انفرادی فروغ نہ پاسکا۔ دوسرا لہجہ جو بلوچی زبان سے قربت رکھتا تھا وہ خود کو بلوچی زبان و ادب میں ضم کرنے پر ہی کامل رہا۔

چنانچہ اٹھارہویں صدی عیسوی سے پہلے ہمیں براہوی زبان میں کوئی نمایاں تحریر نظر نہیں آتی۔ تحفۃ العجائب کے مصنف ملک داد وہ پہلے شاعر ہیں جن سے معیاری ادب کی ابتداء ہوئی۔ اٹھارہویں صدی میں براہوی زبان کے علمی و ادبی شعبوں میں بھی کام ہوا۔ اس دور میں آسمانی کتاب قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا گیا۔

پاکستان کی یک جہتی میں قومی زبان اردو کا کردار

پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ جب کہ پاکستان کی علاقائی زبانیں پنجابی، سندھی،

پشتو، بلوچی اور کشمیری ہیں۔ ان تمام علاقائی زبانوں کا اپنا ایک پس منظر ہے ہر زبان کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ اور اس کا متعلقہ ادب اس کا اہم ثقافتی ورثہ رہا ہے۔ اردو نے قومی زبان کے بطور ان تمام علاقائی زبانوں کو باہمی طور پر مربوط کر دیا ہے۔ ملکی اور قومی لحاظ سے اردو کو خاص حیثیت حاصل ہے کہ ملک کے دستور کے تحت اسے قومی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اور اسے یہ درجہ جن حقائق کی روشنی میں حاصل ہوا ہے وہ یہ تھے کہ یہ نہ صرف علاقائی زبانوں پر فوقیت کی مستحق تھی اس میں دوسرے صوبوں اور علاقوں کو متحد رکھنے کی بھی صلاحیت موجود تھی۔ اردو چونکہ کسی علاقے کی مخصوص زبان نہ تھی اس لیے اسے پاکستان میں ایک مشترکہ زبان کا منصب حاصل ہوا اور وہ قومی یک جہتی اور اتحاد میں معاون ثابت ہوئی علاقائی زبانیں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھیں۔ چنانچہ اردو نے ہی معاشرتی و ثقافتی ہم آہنگ پیدا کرنے کا کام سرانجام دیا اس وسیلہ سے خود علاقائی زبانوں میں اشتراک باہمی پیدا ہوا اردو قومی تشخص کے لیے مضبوط بنیادیں فراہم کرتی ہے اور اردو زبان میں ہماری اسلامی روایات و ثقافت کا اتنا وسیع سرمایہ ہے کہ مسلمان دنیا میں جہاں کہیں بھی ہیں وہ امت واحد ہیں پاکستان کی علاقائی زبانوں میں صرف اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہمارے ہر قسم کی تاریخی ورثوں کی امین ہے۔ یہی زبان ہماری اجتماعی زندگی اور ماحول کی ترجمان ہے اسے ہر پاکستانی آسانی سے اپنا سکتا ہے یہی زبان ہماری فکری اور نظری وحدت کا ذریعہ ہے۔

اردو پاکستان کی قومی زبان ہے اس زبان کو قومی زبان کا درجہ اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ ایک بین الاقوامی زبان ہے اور پوری دنیا میں اس کے بولنے والے پائے جاتے ہیں اس کے علاوہ یہ عام فہم ہے اور مسلمانوں کی عہد یادگار ہے اس میں مسلمانوں کا مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی سرمایہ موجود ہے پاکستان میں علاقائی لحاظ سے چار زبانیں بولی جاتی ہیں گویا پاکستان کے ہر صوبے کی زبان الگ ہے اس لیے یہ ضروری ہے تھا کہ ان صوبوں میں فکری وحدت اور رابطے کے لیے سرکاری سطح پر ایک ہی زبان ہو جس ملک کا ہر شہری اپنے خیالات کا اظہار کر سکے چنانچہ اردو ہی ایک ایسی زبان تھی جو چاروں صوبوں میں یگانگت اور اتحاد کا موثر ذریعہ بن سکتی پس اسی بنا پر اردو کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا۔

اردو نے قومی زبان کا درجہ پاکر قومی یک جہتی کا جو کردار ادا کیا اس سے انکار دشوار۔

اقتصادی منصوبہ بندی اور ترقی

اقتصادی منصوبہ بندی کا مفہوم اور اس کے فوائد

کسی ملک کی ترقی اور خوشحالی کا انحصار بہتر وسائل کی دستیابی اور ان کے مناسب استعمال پر ہوتا ہے۔ معاشی ترقی دراصل ملک کے باشندوں کے معیار زندگی اور فی کس آمدنی میں اضافے کا نام ہے۔ کسی بھی ملک کی ترقی میں معاشی منصوبہ بندی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اسی وجہ سے آج کے دور میں دنیا کے تمام ممالک اپنے وسائل اور اپنی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے معاشی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ اقتصادی منصوبہ بندی سے مراد یہ ہے کہ اپنے معاشی وسائل کے مطابق اپنی ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایک مخصوص عرصہ میں ہدف مقرر کرکے ان سے بہتر نتائج حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا۔

اقتصادی منصوبہ بندی دراصل ایسے پروگرام، پالیسیاں اور راہ عمل کو کہتے ہیں۔ جن پر عمل کرکے ایک قوم منظم بنیادوں پر معاشی ترقی اور خوشحالی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس قسم کی منصوبہ بندی خاص طور پر پاکستان جیسے غریب اور پسماندہ ملک کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ معاشی منصوبہ بندی کیوں ضروری ہے؟ اس کا اندازہ معاشی ترقی کے مندرجہ ذیل فوائد سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ معاشی منصوبہ بندی قومی آمدنی میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔
۲۔ اس سے فی کس سالانہ آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے اور شہریوں کا معیار زندگی بلند ہوتا ہے۔
۳۔ ملک میں بیروزگار لوگوں کے لئے روزگار کے نئے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔
۴۔ معاشی منصوبہ بندی سے افراط زر پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ جس سے قیمتوں کو مستحکم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔
۵۔ معاشی منصوبہ بندی سے غذائی خود کفالت حاصل ہوتی ہے۔
۶۔ معاشی منصوبہ بندی سے مختلف طبقات میں معاشی عدم مساوات دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔
۷۔ معاشی منصوبہ بندی کے ذریعے زرمبادلہ کمانے کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس سے ادائیگیوں کے توازن کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔
۸۔ معاشی منصوبہ بندی کے ذریعے انفرادی مفادات اور فوائد کی بجائے وسیع تر قومی مفاد میں سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔
۹۔ معاشی منصوبہ بندی سے محنت کشوں کے حقوق مثلاً اجرتوں، شرائط ملازمت، اور

اوقات کار وغیرہ کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔
۱۰۔ معاشی منصوبہ بندی سے لمبے عرصے کے منصوبے بنا کر پائیدار اقتصادی ترقی کے لئے حالات پیدا کئے جاسکتے ہیں۔
۱۱۔ معاشی منصوبہ بندی سے سماجی فلاح و بہبود (مثلاً تعلیم، صحت، ٹرانسپورٹ سڑکیں وغیرہ) کے عمل میں زیادہ بہتر طریقے سے اضافہ کیا جاسکتا ہے۔
۱۲۔ معاشی منصوبہ بندی سے آبادی کے بڑھتے ہوئے رجحان کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

پاکستان میں معاشی منصوبہ بندی کی اہمیت

عوام کی خوشحالی اور قومی معیشت کی ترقی کے لئے ملکی وسائل کو بہتر طریقے سے استعمال کرنے کا نام منصوبہ بندی کہلاتا ہے۔ منصوبہ بندی کی پالیسی معاشی ترقی اور خوشحالی کے لئے مرتب کی جاتی ہے یہ ملکی ضروریات اور وسائل کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ معاشی منصوبہ بندی کے لئے ایک قومی منصوبہ بندی کمیشن تشکیل دیا جاتا ہے۔ جو ملکی وسائل اور ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اہم فریضہ سرانجام دیتا ہے۔

پاکستان میں منصوبہ بندی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان میں معاشی منصوبہ بندی کی اہمیت کو درج ذیل نکات سے واضح کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ **ترقی پذیر ملک:** پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ اور یہ ہمیشہ معاشی وسائل سے دوچار رہا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے باشندوں کے مقابلے میں پاکستانی عوام کا معیار زندگی بہت کم ہے۔ طبی سہولتیں بہت کم ہیں اور تعلیمی و رہائشی سہولتیں بھی ناکافی ہیں۔ شرح تعلیم بہت کم ہے۔ بچت کا رجحان اتنا زیادہ نہیں ہے۔ سرمایہ کاری کا رجحان بھی بہت کم ہونے کی وجہ سے یہ چیز ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ وسائل کم ہیں اور آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ غرضیکہ پاکستان تیسری دنیا کے ان ممالک کی صف میں آتا ہے۔ جو کہ ابھی ترقی کی منزل سے گزر رہے ہیں۔

۲۔ **وسائل کو مناسب طریقے سے بروئے کار لانا:** پاکستان میں وسائل کی کمی نہیں۔ لاتعداد قدرتی و انسانی وسائل موجود ہیں۔ لیکن ان کو بروئے کار لانے کی راہ میں بہت سی معاشی، معاشرتی اور بین الاقوامی رکاوٹیں حائل ہیں۔ مثلاً لوگوں کی آمدنی بہت کم ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بچت نہیں کر پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ کاری کی سطح بھی پست ہے۔ اگر مناسب منصوبہ بندی کی جائے۔ تو ان رکاوٹوں کو دور کیا جاسکتا ہے۔ حکومت ان مسائل کے سدباب کے لئے موثر منصوبہ بندی کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ سائنسی و تکنیکی صلاحیتوں کو اپنا کر اب ان معاشی رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ معاشی منصوبہ بندی کے ذریعے ان وسائل کا بہتر استعمال کیا جاسکتا ہے اور معاشی و

معاشرتی بہبود کے مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ معاشی منصوبوں کو کامیاب بنانے کے لئے نہ صرف ملکی وسائل کو بھرپور طریقے سے بروئے کار لایا جانا چاہئے۔ بلکہ غیر ملکی ماہرین کی خدمات سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ شرح پیدائش کا مقابلہ کرنے کے لئے قومی آمدنی میں اضافے کی ضرورت: معاشی منصوبہ بندی اس لئے کی جاتی ہے' تاکہ شہری خوش و خرم' مطمئن اور خوشحال زندگی بسر کر سکیں۔ اور یہ اسی صورت ممکن ہو سکتا ہے۔ جب قومی آمدنی میں اضافہ کی شرح تین فیصد سے زیادہ ہو۔ گویا ہر سال ۲۷ لاکھ نئے افراد کو سہولتیں بہم پہنچانے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ پاکستان میں منصوبہ بندی کا اہم مقصد یہی ہے کہ قومی پیداوار میں اتنا اضافہ کیا جائے کہ اس شرح پیدائش میں اضافے کا مقابلہ کیا جاسکے۔ کیونکہ اگر افزائش آبادی میں اضافے کی شرح آمدنی کی شرح سے زیادہ ہو جائے۔ تو افراد کی فی کس آمدنی میں کمی واقع ہوگی۔ اور معاشی ترقی کے عمل میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ اور پاکستان کے عوام اس چیز کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس' ٹیکنالوجی اور تکنیکی میدانوں میں ترقی کی کاوشیں ہو رہی ہیں تاکہ معاشی ترقی کی رفتار کو تیز کیا جاسکے۔

۴۔ ملکی معیشت کے مختلف شعبوں کی مناسب دیکھ بھال اور ترقی: ملکی معیشت کی حیثیت زندہ جسم کی طرح ہوتی ہے۔ اور اس میں بے شمار شعبے شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً صنعت' تجارت' زراعت' تعمیرات' نقل و حمل' کان کنی' صفائی' بجلی و گیس' مکانات' تعلیم' سماجی بہبود' محنت وغیرہ۔ ان شعبوں کی مناسب دیکھ بھال اور ترقی بہتر منصوبہ بندی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ منصوبہ بندی کے ذریعے مختلف شعبوں کی ترقی کے لئے ہدف مقرر کر دیئے جاتے ہیں۔ اور مناسب مالیاتی وسائل کے ذریعے اس ہدف کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۵۔ قومی آمدنی میں مسلسل اضافہ کرنا: معاشی ترقی ایک مسلسل اور لمبا عمل ہے۔ اس کو ایک دو سالوں کے لئے محدود نہیں کیا جاسکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک سال بہتر موسمی حالات کی وجہ سے زرعی آمدنی اور پیداوار میں اضافہ ہو جائے لیکن اگلے سال حالات خراب ہو جانے کی وجہ سے اس آمدنی میں کمی بھی واقع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا معاشی ترقی تو اسی وقت ہو سکتی ہے۔ جب ایک طویل عرصہ تک قومی آمدنی میں مسلسل اضافہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ معاشی ترقیاتی منصوبوں کی مدت پانچ سال سے کم نہیں رکھی جاتی۔ پاکستان میں بھی یہ مدت پانچ سال ہے چونکہ معاشی ترقی کو جانچنے کے لئے طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ لہٰذا اس چیز کے پیش نظر بعض اوقات طویل المدت تناظری منصوبے بھی بنائے جاتے ہیں۔ جن کی مدت بیس (۲۰) سال تک ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس بیس سال کے دوران پانچ سالہ منصوبے اس طویل المیعاد منصوبے کا ہی حصہ ہوتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک میں طویل المیعاد منصوبوں کی

ضرورت اس لئے بھی محسوس ہوتی ہے۔ کہ بہت سے معاشی پراجیکٹ لمبے عرصے کے ہوتے ہیں۔ اور ان کی تکمیل کے لئے طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ اگر کسی پانچ سالہ منصوبہ کے ہدف غیر موافق معاشی حالات کی وجہ سے پورے نہ ہو سکیں۔ تو انہیں تناظری منصوبے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ تاکہ اس ہدف کو پورا کیا جاسکے۔ مختصراً منصوبہ بندی کا مقصد طویل عرصے تک کسی ملک کی قومی آمدنی میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ ملک تمام شعبوں میں ترقی کر سکے۔ اور لوگوں کا معیار زندگی فی کس آمدنی میں اضافہ کر کے بلند کیا جاسکے۔

۶۔ آزاد خارجہ پالیسی: پاکستان ایک ترقی پذیر اور پسماندہ ملک ہونے کے ساتھ ساتھ جغرافیائی لحاظ سے دنیا کے انتہائی حساس خطے میں واقع ہے۔ اور اس کے آس پاس بھارت اور روس جیسے دشمن ممالک واقع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی دفاعی اور معاشی ضروریات کی کفالت کے لئے پاکستان دوسرے ممالک خصوصاً مغربی ممالک کا شروع سے محتاج رہا ہے۔ لہٰذا خارجہ تعلقات کو آزادانہ بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے دفاعی اور معاشی منصوبہ بندی بہت ضروری ہے۔ یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ اگر ملک کے اندرونی وسائل کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لا کر ملک کے اندر ہنرمند افراد اور ماہرین کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔

۷۔ ہنگامی حالات کا مقابلہ: سیاسی عدم استحکام اور قومی یکجہتی کے فقدان کی وجہ سے پاکستان کو شروع سے ہی ہنگامی حالات کا سامنا رہا ہے۔ ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے جہاں دیگر عوامل کی ضرورت ہے۔ وہاں معاشی منصوبہ بندی کی بہت ضرورت ہے۔

قیام پاکستان کے وقت ہر شعبے کی حالت بہت ابتر تھی۔ معیشت پسماندہ' سہولتیں محدود' کاشتکاری کے پرانے طریقے' صنعت برائے نام' زراعت میں مشینوں کا استعمال بہت کم' نقل و حمل' رسل و رسائل اور خبر رسانی کے ذرائع محدود تھے۔ چنانچہ ان ابتر حالات میں پاکستان نے اپنی معاشی ترقی کی ابتداء کی۔

۱۹۵۱ء میں چھ سالہ ترقیاتی منصوبے کے ساتھ پاکستان کی معاشی ترقی کا آغاز ہوا۔ منصوبہ بندی میں ماہر نہ ہونے کی وجہ سے یہ منصوبہ پوری طرح کامیاب نہ ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں منصوبہ بندی کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔ جس کا مقصد ملکی وسائل کی بہتر منصوبہ بندی کرنا تھا۔ اس کمیشن کے تحت پہلا پانچ سالہ منصوبہ ۶۰-۱۹۵۵ء میں تیار کیا گیا۔

ساتویں پانچسالہ ترقیاتی منصوبے کے اہم بنیادی مقاصد

ساتواں پانچسالہ منصوبہ ۹۳-۱۹۸۸ء یکم جولائی ۱۹۸۸ء کو شروع کیا گیا اور اس کی مدت ۳۰ جون ۱۹۹۳ء تک تھی۔ اس منصوبے کا ہدف یہ تھا کہ زرعی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ

کی جائیں گی۔ ۱۳۰ ارب روپے کے زرعی قرضے مہیا کرنے کے بارے میں کہا گیا کہ یہ سہولت زیادہ تر چھوٹے کاشتکاروں کو مہیا کی جائے گی۔ منصوبے میں ۱۲ ارب روپے زراعت کے لئے مختص کئے گئے جو کہ کل خرچ کا تین فیصد تھا۔ اس منصوبے میں زراعت میں جدید تکنیکی طریقے اختیار کر کے اسے بہتر بنانے کے لئے کہا گیا۔ ملک کی ۶۹ فیصد دیہی آبادی کو اس منصوبے کے آخر تک بجلی فراہم کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ ۸۵۰۰ کلومیٹر نئی سڑکوں کی تعمیر کے بارے میں کہا گیا۔ اس منصوبے میں یہ کہا گیا کہ صحیح منصوبہ بندی کر کے پورے ملک سے بیروزگاری کو ختم کر دیا جائے گا۔ اس منصوبے میں صنعتی شعبے میں سرکاری سرمایہ کاری کو کم کر کے نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی پر زور دیا گیا۔ اس منصوبے کے تحت یہ کہا گیا کہ نجی شعبے کے تحت ۱۳۳۰ میگاواٹ بجلی پیدا کی جائے گی۔ اس منصوبے کے تحت ملک سے جہالت ختم کرنے کے لئے کہا گیا کہ پانچ سے نو سال کی عمر کے ہر بچے کو لازمی پرائمری تعلیم دی جائے گی۔ فنی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ اس منصوبے میں مختلف شعبوں کے لئے جو رقم مختص کی گئی وہ درج ذیل تھی۔

نام شعبہ	کل رقم (ارب روپوں میں)	کل اخراجات کا فیصد
زراعت	۱۲	۰۳
پانی	۳۰	۰۹
طاقت کے ذرائع	۱۳۲	۳۸
صنعت اور معدنیات	۱۷	۰۵
ذرائع رسل و رسائل و خبر رسانی	۶۴	۱۸
تعلیم	۲۴	۰۷
صحت	۱۴	۰۴
پبلک ہیلتھ اور انجینئرنگ	۲۷	۰۸
دیہی سڑکیں	۰۵	۰۱
دیگر شعبے	۲۵	۰۷

ساتویں پنجسالہ منصوبہ میں مرکزی حکومت کے لئے ۹۴ اور صوبائی حکومتوں کے لئے ۹۰ ارب روپے مختص کئے گئے۔ صوبوں میں ۹۰ ارب روپے کی تقسیم اس طرح تھی۔

صوبے کا نام	اخراجات (ارب روپوں میں)	کل اخراجات کا فیصد
پنجاب	۴۴	۵۲.۲
سندھ	۱۷.۴	۲۱
سرحد	۱۴.۴	۱۷
بلوچستان	۰۸.۳	۰۹.۸

خصوصی ترقیاتی پروگرام		۰۵.۶
میزان	[illegible]	[illegible]

ساتویں پانچسالہ منصوبے کے بنیادی مقاصد درج ذیل تھے۔

۱۔ ملک میں تعلیم کو ترقی دے کر اخوت، بھائی چارے اور ملکی سلامتی کی راہ ہموار کرنا۔
۲۔ خود کفالت کے حصول کے لئے جدید ٹیکنالوجی کا عام استعمال تاکہ غیر ملکی امداد اور قرضوں پر انحصار کم کیا جا سکے۔
۳۔ جوانوں اور عورتوں کی فلاح و بہبود اور بہتری کے لئے ایسے پروگرام وضع کرنا کہ جس سے یہ دونوں طبقے ملک کی ترقی میں اہم کردار ادا کر سکیں۔
۴۔ پسماندہ علاقوں خصوصاً دیہی علاقوں کو ترقی دے کر جہالت اور غربت کا خاتمہ۔
۵۔ ملک میں مکمل روزگار کا حصول اور معاشی ترقی کی رفتار کو برقرار رکھنا۔
۶۔ تمام تعلیم یافتہ افراد کو روزگار مہیا کرنے کا انتظام کرنا۔
۷۔ غیر ملکی امداد اور قرضوں پر کم سے کم انحصار تاکہ خود کفالت کی منزل کا حصول ممکن ہو سکے۔
۸۔ تعلیم کو عام کرنا اور انسانی ذرائع کو ترقی دینا۔
۹۔ زیادہ سے زیادہ آبادی کو خوراک، صحت، ٹرانسپورٹ، تعلیم، رہائش اور بعض دیگر سہولتیں زیادہ سے زیادہ مہیا کرنا۔
۱۰۔ سرکاری شعبے پر دباؤ کم کرنے کے لئے نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرنا۔
۱۱۔ فی کس آمدنی میں ۶.۵ فیصد شرح کے حساب سے سالانہ اضافہ کرنا تاکہ عوام کا معیار زندگی بہتر ہو سکے۔

چھٹے منصوبے کی طرح اس منصوبے میں بھی اس بات پر خاص توجہ دی گئی کہ ایک خاص حکمت عملی کے تحت بنیادی ضروریات زندگی زیادہ سے زیادہ فراہم کی جائیں اور لوگوں کو زیادہ سے زیادہ روزگار کے مواقع مہیا کئے جائیں۔

آٹھویں پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے کے اہم بنیادی مقاصد

آٹھویں پانچ سالہ معاشی منصوبے کی مدت یکم جولائی ۱۹۹۳ء تا ۳۰ جون ۱۹۹۸ء مقرر کی گئی ہے۔ قومی اقتصادی کونسل نے ۱۳ مئی ۱۹۹۴ء کو اس منصوبے کی منظوری دی۔ منصوبے کا اہم ترین مقصد عوام کی معاشرتی اور معاشی بہبود میں اضافہ کرنا ہے۔
اس منصوبے میں یہ کہا گیا ہے کہ سرکاری شعبہ کے مقابلہ میں نجی شعبہ میں زیادہ سرمایہ کاری کی جائے گی۔ اور سرکاری شعبہ میں ترقیاتی پروگرام زیادہ تر سالانہ ترقیاتی پروگرام کے تحت مکمل کئے جائیں گے۔ اس منصوبے کے تحت صنعت، تیل و گیس کے وسائل کی ترقی، بجلی کی پیداوار،

بندرگاہوں کی ترقی، جہاز رانی کا فروغ، ٹیلی کمیونی کیشن کی خدمات میں توسیع وغیرہ پر براہ راست غیر ملکی سرمایہ کاری کی اجازت دی گئی ہے۔ منصوبے میں کہا گیا ہے۔ کہ قومی بچتوں کی شرح بڑھانے کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔ اور حکومت ایسے اقدامات بروئے کار لائے گی کہ جس سے نجی شعبہ اطمینان بخش طریقہ سے معاشی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکے۔ توانائی اور صنعت کاری پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ اور بیرونی وسائل پر انحصار میں کمی کے لئے کوششیں کی جائیں گی۔ آٹھویں منصوبے کا ایک اہم مقصد بیروزگاری کو ختم کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے آئندہ پانچ سالوں میں ملک کے اندر کل ۷۳ لاکھ ۸۰ ہزار نئے روزگاری مواقع پیدا کئے جائیں گے۔ آٹھویں منصوبے کے دوران چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی کی طرف زیادہ توجہ دی جائے گی۔ کیونکہ چھوٹی صنعتوں میں روزگاری مواقع پیدا کے لئے نسبتاً تھوڑی سرمایہ کاری درکار ہوتی ہے۔

آٹھویں منصوبے کی تکمیل پر ۱۷۰۰.۰۵ بلین روپے خرچ ہونگے۔ اس میں سے ۹۴۸.۳ بلین روپے نجی معینہ سرمایہ کاری کی شکل میں اور ۷۵۲.۱ بلین روپے سرکاری شعبے میں خرچ ہونگے۔
اس منصوبے میں مختلف شعبوں کے لئے جو رقم مختص کی گئی۔ وہ درج ذیل ہے۔

	نام شعبہ	کل رقم (ارب روپوں میں)
۱-	زراعت	۵.۱۷-
۲-	پانی	۰۵.۵۷-
۳-	طاقت کے ذرائع	۳۰۲.۰۳-
۴-	صنعت و معدنیات	۸.۴۹-
۵-	ذرائع رسل و رسائل و خبر رسانی	۱۳۳.۰۷-
۶-	تعلیم و افرادی قوت وغیرہ	۱۶.۸۸-
۷-	صحت	۵.۱۵-
۸-	بہبود آبادی و دیہی ترقی وغیرہ	۱۵.۳۲-
۹-	فزیکل پلاننگ و ہاؤسنگ	۶.۸۱-
۱۰-	ماحولیات	۳.۵۳-
۱۱-	پیپلز پروگرام	۱۵.۰۰
۱۲-	خاص علاقے	۲۴.۸۶-
۱۳-	صوبے، تعمیر سندھ و افغان مہاجرین وغیرہ	۱۶۲.۷۸-
۱۴-	دیگر	۷.۵۴
	میزان	۷۶۲.۲۰

آٹھویں پانچ سالہ منصوبے کے بنیادی مقاصد درج ذیل ہیں۔
۱- قومی آمدنی میں اضافہ کیا جائے گا۔ مجموعی داخلی پیداوار میں سالانہ سات فیصد اضافہ کیا جائے گا۔ زرعی شعبہ میں سالانہ ۴.۹ فیصد اور صنعتی شعبہ میں ۹.۹ فیصد اضافہ ہوگا۔
۲- نئے روزگاری مواقع میں اضافہ کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے باسٹھ لاکھ نئے روزگاری مواقع پیدا کئے جائیں گے۔ اور نجی اور سرکاری دونوں شعبوں میں روزگار کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔
۳- ملک کی معاشی خوشحالی اور ترقی میں سب لوگوں کو شریک کرنے کے لئے دولت کی منصفانہ تقسیم عمل میں لائی جائے گی۔
۴- ملک سے غربت کے خاتمے کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔ اس مقصد کے لئے لوگوں کی آمدنیاں بڑھانے، انسانی وسائل کو ترقی دینے، بہبود آبادی کے لئے اقدامات کرنے اور پسماندہ طبقوں اور علاقوں کے لئے خصوصی پروگرام بنائے جائیں گے۔
۵- خود انحصاری کے حصول کے لئے غذائی پیداوار، توانائی، سرکاری مالیات بڑھانے اور بیرونی ادائیگیوں کا توازن درست کرنے پر توجہ دی جائے گی۔
۶- قومی بچتوں کے تناسب میں اضافہ کیا جائے گا۔
۷- بجٹ خسارے کو کم کیا جائے گا۔
۸- معاشی استحکام کو یقینی بنایا جائے گا۔ تاکہ منصوبہ کامیاب ہو سکے۔
۹- آبادی کی شرح افزائش کو ۲.۹ فیصد سے کم کر کے ۲.۷ فیصد کیا جائے گا۔
۱۰- شرح خواندگی کو ۳۵ فیصد سے بڑھا کر ۴۸ فیصد کر دیا جائے گا۔
۱۱- دیہی سطح پر صحت کی بنیادی سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔
۱۲- شیر خوار بچوں کی شرح اموات کو کم کیا جائے گا۔
۱۳- دیہاتوں اور شہروں میں پینے کا صاف پانی مہیا کیا جائے گا۔
۱۴- شہری اور دیہاتی آبادی کو سیوریج (گندے پانی کے نکاس) کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔

زراعت

پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ زراعت کو پاکستان کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ کل آبادی کا ۷۲ فیصد لوگ دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ جو بالواسطہ یا بلاواسطہ زراعت سے منسلک ہیں۔ زرمبادلہ کا کثیر حصہ ہم زرعی اجناس کی برآمد سے حاصل کرتے ہیں۔ زراعت ترقی پذیر صنعتوں کے لئے خام مال مہیا کرتی ہے۔ زراعت کی وجہ سے ہی ملک کے لاکھوں افراد کو روزگار مہیا ہوتا ہے۔

فصلیں: پاکستان میں دو طرح کی فصلیں کاشت کی جاتی ہیں۔

۱۔ فصل ربیع: برسات کے فوراً بعد اکتوبر نومبر یعنی سردیوں کے آغاز میں فصل ربیع کی بوائی ہوتی ہے۔ اور اپریل مئی یعنی گرمیوں کے آغاز میں اس کی کٹائی ہوتی ہے
فصل ربیع میں گندم، جو، چنا، تمباکو، تیل نکالنے کے بیج اور سبزیاں وغیرہ شامل ہیں۔

۲۔ فصل خریف: خریف کی فصل اپریل سے جون تک کاشت کی جاتی ہے اور اکتوبر نومبر میں کاٹ لی جاتی ہے۔ اس میں زیادہ اہم کپاس، گنا، چاول اور مکئی ہیں زرعی فصلوں کو مزید دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(i) غذائی فصلیں: اس میں گندم، چاول، چنا، مکئی وغیرہ شامل ہیں۔

(ii) تجارتی فصلیں: اس میں کپاس، گنا اور تمباکو وغیرہ شامل ہیں۔

پاکستان کی معیشت میں زراعت اور دیہی ترقی کی اہمیت

زراعت کو پاکستان کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے ملکی معیشت کو سنوارنے کے لئے اسے بہتر بنانا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کو بہتر بنا کر ہی عوام کو خوشحال کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سال میں دو فصلیں کاشت کر کے فی ایکڑ پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے تاکہ قومی آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔ جدید اصول اپنا کر فی ایکڑ پیداوار کا تناسب بڑھایا جا سکتا ہے مثلاً کاشتکاروں کو کھاد اور اچھے معیار کے بیج کی فراہمی، پانی کی فراہمی اور مشینی کاشت وغیرہ۔ ملکی معیشت میں کھاد اور دیہی ترقی کی اہمیت اس اعتبار سے بہت زیادہ ہے۔ مندرجہ ذیل نکات سے زراعت کی اہمیت کو واضح کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ غذائی فراہمی: زرعی شعبہ پورے ملک کو غذا فراہم کرتا ہے۔ اگر زراعت مضبوط بنیادوں پر استوار نہ ہو تو پھر زرعی اجناس دوسرے ملک سے درآمد کرنا پڑتی ہیں۔

۲۔ خام مال: صنعتوں کے لئے خام مال زرعی شعبے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ اگر خام مال اپنے ملک سے میسر نہ آسکے تو پھر دوسرے ملک سے اسے مہنگے داموں درآمد کرنا پڑتا ہے۔

۳۔ روزگار: زرعی شعبہ ملک کی اکثریت کو روزگار فراہم کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے ہمارے ہاں ۷۲ فیصد لوگوں کا دارومدار معاشی اعتبار سے زراعت پر ہے۔

۴۔ زرمبادلہ کا حصول: زراعت زرمبادلہ کے حصول کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

۵۔ صنعتی ترقی: صنعتی ترقی زرعی ترقی کی مرہون منت ہے۔ اگر زراعت کو جدید بنیادوں پر استوار کر کے مشینی کاشت وغیرہ کا اہتمام ہو تو افرادی قوت صنعتوں میں کام کرے گی۔ جس سے صنعتی ترقی میں اضافہ ہو گا۔

۶۔ معاشی ترقی میں انقلاب: زراعت سے نہ صرف صنعت بلکہ تجارت اور کاروبار بھی پھلتا پھولتا ہے۔ اس سے ملکی معیشت میں حقیقی انقلاب رونما ہوتا ہے۔

۷۔ قرضوں سے چھٹکارا: جتنی زیادہ زرعی ترقی ہو گی اتنی ہی زیادہ دوسرے شعبوں کی ترقی ہو گی۔ اس طرح زرعی ترقی غیر ملکی قرضوں سے چھٹکارا دلانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

۸۔ درآمد و برآمد میں توازن: زرعی پیداوار کی برآمد کے بدلے ہم دفاعی اسلحہ اور بھاری مشینری درآمد کر سکتے ہیں۔ اس سے درآمد و برآمد میں توازن پیدا ہوتا ہے۔

پاکستان میں زرعی پسماندگی کے اسباب یا دیہی ترقی کے راستے میں حائل رکاوٹیں

اگرچہ پاکستان کی سرزمین بڑی زرخیز ہے۔ اور یہاں کے لوگ بھی بڑے محنتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود ہماری زراعت پسماندہ ہے۔ اور فی ایکڑ پیداوار دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے میں کم ہے اس کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

۱۔ کاشتکاری کے ناقص طریقے: ہمارے کسان جدید زرعی تعلیم سے عدم واقفیت کی وجہ سے مشینی فوائد سے محروم ہیں۔ مالی وسائل محدود ہونے کی وجہ سے کسان زرعی آلات خریدنے کی سکت نہیں رکھتے لہٰذا وہ پرانے آلات کاشتکاری استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔

۲۔ غیر معاشی قطعات: ہمارے ہاں بعض قطعات اراضی اتنے چھوٹے ہیں۔ کہ ان پر مشینی طریقے سے کاشت کاری نہیں ہو سکتی۔ بعض اوقات ایک کسان کی زمین مختلف مقامات پر بکھری ہوئی ہونے کی وجہ سے بھی جدید آلات کاشت کاری کے استعمال میں رکاوٹ پیش آتی ہے۔

۳۔ زمین داری نظام: ہمارا زمین داری نظام زرعی پیداوار کے حصول میں بڑی رکاوٹ ہے۔ بڑے بڑے زمین دار اپنی زمین کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے مزارعین کو کاشت کے لئے دے دیتے ہیں۔ اور خود غیر حاضر رہتے ہیں۔ اور پیداوار بڑھانے میں زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔

۴۔ آبادی کا بڑھاؤ اور سرمایہ کی کمی: آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے بہت سے کاشت کاروں کی معاشی حالت ابتر ہوتی جا رہی ہے۔ بہت سے کاشت کار کھاد، ادویات اور جدید زرعی آلات وغیرہ کے استعمال کی استطاعت نہیں رکھتے۔

۵۔ جہالت: کاشت کاروں کی اکثریت ان پڑھ ہونے کی وجہ سے کاشت کاری کے جدید تقاضوں سے آشنا نہیں ہے۔ اور کاشت کاروں کی اکثریت مقدمے بازی اور لڑائی جھگڑے میں الجھی رہتی ہے۔

۶۔ سیم و تھور: ہر سال ہزاروں ایکڑ زمین سیم و تھور کی زد میں آ جاتی ہے حکومت ٹیوب ویلوں کے ذریعے اسے ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے مگر اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے وسائل کم ہیں۔

۷۔ سیلاب: سیلابوں کی وجہ سے زمین دریاؤں کے کٹاؤ اور بہاؤ کی زد میں آ جاتی ہے۔ بعض جگہوں مثلاً ضلع راولپنڈی و میانوالی میں جنگلات لگا کر اور پشتہ بندی کے ذریعے دریا بردگی کے عمل کو روکنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۸۔ پانی کی کمی: بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر نہری نظام ناکافی ثابت ہو رہا ہے بعض جگہ ٹیوب ویل لگائے جاتے ہیں۔ مگر یہ نظام بہت مہنگا پڑتا ہے۔

۹۔ ناقص بیج: اچھے بیج کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ گوبر جیسی قیمتی کھاد کو ایندھن کے طور پر استعمال کر لیا جاتا ہے۔

۱۰۔ پودوں کی بیماریاں: زرعی پیداوار کا بڑا حصہ کیڑوں مکوڑوں، پرندوں اور بیماریوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ زرعی ادویات کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔

۱۱۔ کمزور جانور: کاشتکاری کے لئے استعمال کئے جانے والے جانور بہت کمزور اور لاغر ہوتے ہیں لہٰذا ان کی استعداد کافی پست ہوتی ہے۔

۱۲۔ زرعی منصوبہ بندی کی کمی: فصلوں کی کاشت کسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں کی جاتی جس کی وجہ سے پیداوار بہت کم ہوتی ہے۔

۱۳۔ سیاسی عدم استحکام: پاکستان شروع سے ہی سیاسی عدم استحکام کا شکار رہا ہے۔ حکومتوں کا آئے دن بدلنا، مارشل لاء کا قیام، بھارت کے ساتھ جنگیں، بنگلہ دیش کا قیام وغیرہ سیاسی عدم استحکام کی مثالیں ہیں۔

۱۴۔ غیر منظم زرعی منڈیاں: ایک طرف فی ایکڑ پیداوار کم ہے۔ اور دوسری طرف زرعی اجناس کی فروخت کا انتظام انتہائی ناقص ہے لہٰذا کاشت کار اپنی فصلوں کی صحیح قیمت وصول نہیں کر پاتے دیہاتوں کو شہروں سے ملانے والی سڑکیں کچی ہیں۔ لہٰذا کاشت کار بیوپاریوں کو سستے داموں اپنا مال بیچنے پر مجبور ہیں۔ گوداموں کی کمی بھی اس راہ میں حائل ہے۔

زرعی پسماندگی کے حل کے لئے تجاویز

حکومت زرعی مسائل سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اور ان کے حل کے لئے بھرپور کوشش کرتی رہتی ہے۔ مثلاً زرعی ترقیاتی بنک و دیگر بنکوں کے ذریعے چھوٹے کاشتکاروں کو بلاسود قرضے دیئے جاتے ہیں۔ کیمیاوی کھاد کی مقدار و معیار کو بڑھانے کے لئے نئے کارخانے لگائے جا رہے ہیں۔ زرعی تحقیق کے لئے فیصل آباد و ٹنڈو جام کی یونیورسٹیوں میں کام ہو رہا ہے۔ اسلام آباد میں ایگریکلچرل ریسرچ کونسل کام کر رہی ہے۔ حکومت وقتاً فوقتاً زرعی پیداوار کی نئی قیمتیں مقرر کرتی رہتی ہے۔ تاکہ کسانوں کو ان کی جائز محنت کا صلہ ملتا رہے۔ حکومت کے ان اقدامات سے زرعی پسماندگی کو دور کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ تاہم اس سلسلے میں درج ذیل مزید اقدامات کی ضرورت ہے۔

۱۔ اشتمال اراضی کے ذریعے قطعات اراضی کو مناسب حصوں میں تقسیم کرنا یعنی قطعات اراضی کا نہ بہت بڑا اور نہ بہت چھوٹا ہونا بلکہ مناسب ہونا۔

۲۔ کاشتکار اور مالک میں خوشگوار تعلقات قائم کرنا۔

۳۔ ایک مالک کی زمین بکھری ہوئی نہ ہو بلکہ یکجا ہو۔

۴۔ زرعی سہولتوں کی فراہمی۔

۵۔ زراعت کی تعلیم کا بندوبست کرنا تاکہ زرعی مسائل کو سائنسی بنیادوں پر حل کیا جا سکے۔

۶۔ اندرون ملک زرعی آلات کی تیاری کی طرف توجہ دینا۔

۷۔ شجر کاری کی مہم میں اضافہ تاکہ کٹاؤ کے عمل کو روکا جا سکے۔

۸۔ بنجر زمین کو زیر کاشت لانے کے اقدامات۔

۹۔ آبپاشی کے نظام کو وسیع کرنا۔

۱۰۔ نظام زمین (یعنی 'زراعت' سرمایہ 'مالیہ' آبیانہ وغیرہ) کی اصلاح۔

۱۱۔ زرعی اصلاحات تاکہ بڑی بڑی جاگیرداریاں اور زمینداریاں ختم کی جا سکیں۔ اور مزارعین و کاشت کاروں کا استحصال ختم ہو۔ اور انہیں تحفظ ملے۔

۱۲۔ زرعی پیداوار کی مناسب قیمت وصول کرنے کے لئے زرعی منڈیوں کی اصلاح کر کے انہیں منظم اور مکمل بنایا جائے۔

۱۳۔ نئی نہروں کی کھدائی عمل میں لائی جائے۔ چھوٹے بڑے بندوں کے ساتھ زیر زمین پانی کے ذخائر کو استعمال میں لانے کے لئے اقدامات کئے جائیں۔

صنعت

قیام پاکستان کے وقت ہمارا ملک صنعتی اعتبار سے انتہائی پسماندہ تھا۔ اس وقت ہمارے حصے میں کپڑے کے سترہ، چینی کے نو، سیمنٹ کے پانچ، شیشے کے چار، اور اون کا ایک کارخانہ

آیا۔ لیکن ان صنعتوں کو بھی زیادہ تر غیر مسلم چلا رہے تھے۔ تقسیم کے بعد ان کی اکثریت بھارت منتقل ہو گئی اس طرح یہ صنعتیں بھی بحران کا شکار ہو گئیں۔ چنانچہ صنعتی ترقی کی ابتدا پاکستان نے خود ہی کی۔

پاکستان میں صنعت و حرفت اور اس کی اہمیت

پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ لیکن آج کا دور بین الاقوامی معاشی مقابلے کا دور ہے۔ لہٰذا اپنی روزمرہ کی ضروریات میں خود کفیل ہونا اور بین الاقوامی تجارت میں توازن پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر ملک برآمدات میں حصہ لے اور ایسی اشیاء تیار کرے جن کی بیرون ملک مانگ ہو۔ پاکستان میں صنعتی ترقی کی اہمیت درج ذیل نکات سے واضح ہو جاتی ہے۔

۱۔ زرعی ترقی کے لئے اہمیت: جدید زرعی آلات کے حصول کے لئے صنعتوں کی ضرورت ہے۔ اگر اندرون ملک یہ اشیاء تیار کر کے زرمبادلہ کمایا جا سکے۔ جس کی ہمارے ہاں اکثر کمی رہتی ہے۔

۲۔ زرعی خام مال کی کھپت: صنعتیں نہ ہوں تو زرعی خام مال سستے داموں باہر بھیجنا پڑتا ہے۔ صنعتوں کے قیام سے ایک تو تیار شدہ مال اپنے ملک میں لے گا۔ دوسرے زرمبادلہ حاصل ہو گا۔ اور تیسرے یہ کہ لوگوں کو صنعتوں میں روزگار ملے گا۔ اور بحیثیت مجموعی اس سے قومی آمدنی میں اضافہ ہو گا۔

۳۔ برآمدات میں اضافہ: برآمدات میں موثر اضافہ اور زرمبادلہ کے حصول کے لئے صنعتی ترقی ناگزیر ہے۔

۴۔ بلند معیار زندگی: صنعتی ترقی سے لوگوں کو سستی اشیاء میسر آتی ہیں اور بحیثیت مجموعی ان کا معیار زندگی بلند سے بلند تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

۵۔ حکومت کی آمدنی میں اضافہ: صنعتوں کے قیام سے حکومت کی آمدنی میں ٹیکس وصول کر کے اضافہ ہوتا ہے اور اس دولت کو عوامی فلاح و بہبود کے کاموں پر خرچ کر کے ملک کو فلاحی مملکت بنایا جا سکتا ہے۔

۶۔ دفاعی ضروریات کی تکمیل: دفاعی ساز و سامان اور ضروری سامان جنگ تیار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ملک میں زیادہ سے زیادہ صنعتیں قائم ہوں تاکہ دفاعی استحکام حاصل کیا جا سکے۔

۷۔ خارجہ تعلقات: صنعتی ترقی کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے۔ کہ خارجہ تعلقات کے ضمن میں آزادانہ پالیسی اختیار کی جا سکتی ہے۔

۸۔ روزگار کی فراہمی: صنعتی ترقی سے بیروزگاری کا خاتمہ ہوتا ہے۔ لوگ معاشی تفکرات سے بے نیاز ہو کر سیاسی معاملات میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

قدرتی وسائل: صنعتی ترقی سے قدرتی وسائل کو صنعتوں میں استعمال کر کے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

سستی اشیاء: صنعتی ترقی سے اندرون ملک سستی اشیاء میسر آ سکتی ہیں۔

ہنگامی حالات کا مقابلہ: صنعتی ترقی سے ہنگامی حالات میں بیرون ملک سے مدد حاصل کئے بغیر حالات کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

زرمبادلہ کی بچت: صنعتی ترقی کی وجہ سے زرمبادلہ کا کثیر حصہ ملک میں رہنے کی وجہ سے ملک اقتصادی طور پر خوشحال ہو سکتا ہے۔

معاشرتی زندگی پر خوشگوار اثر: صنعتی ترقی سے لوگ خوشحال ہو جاتے ہیں۔ جس سے معاشرتی زندگی پر خوشگوار اثر پڑتا ہے اور جہالت اور غربت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ لوگ معاشرتی برائیوں سے دور بھاگتے ہیں۔

پاکستان کی صنعتی مشکلات

تقسیم ملک کے وقت تمام بڑے بڑے کارخانے ہندوستان میں رہ گئے جس سے ملک صنعتی اعتبار سے ختم ہو کر رہ گیا ملک کے اندر پٹ سن، اونی و ریشمی کپڑا، جہاز سازی، سگریٹ، گتہ اور فولاد سازی کا ایک کارخانہ بھی نہ تھا۔ سوتی کپڑے، سیمنٹ، چینی، شیشہ سازی کے چند ایک کارخانے تھے۔ مگر ان کی حالت بہت خراب تھی۔ ملک کو تقسیم کے وقت صنعتی میدان میں بہت سی مشکلات درپیش تھیں جن میں سے اہم یہ ہیں۔

- مہاجرین کی آمد اور آباد کاری سے حکومت معاشی طور پر بہت کمزور تھی۔
- بنکوں میں کام کرنے والا عملہ غیر تربیت یافتہ تھا۔
- ہندوستان سے شدید دشمنی کی وجہ سے شروع سے ہی دفاع پر بہت خرچ کرنا پڑا۔
- تربیت یافتہ مزدوروں کی کمی تھی۔
- فنی ماہرین اور انجینئروں کی کمی کے ساتھ ساتھ انہیں تربیت دینے والے ادارے نہ تھے۔
- پاکستان کے دونوں حصوں میں ایک ہزار میل کا فاصلہ تھا جس سے صنعتی طور پر ایک دوسرے کی مدد کرنے میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔
- آبادی بڑھنے کی شرح میں بہت اضافہ ہوا۔ دوسرے سیلابوں کی وجہ سے خوراک کا مسئلہ پیدا ہوا۔ جس سے صنعت کی طرف توجہ نہ دی جا سکی۔
- جغرافیائی لحاظ سے ہمارے ہاں معدنی وسائل مثلاً تیل کوئلہ اور لوہے وغیرہ کی کمی رہی ہے۔ ان کے بغیر صنعتی ترقی خاصی مشکل ہے۔ دوسرے یہ کہ زرعی اور خام مال کے

مرکز سمندر سے بہت دور ہیں۔ جس کی وجہ سے نقل و حرکت کی مشکلات درپیش آتی ہیں
عموماً صنعتیں بندرگاہ کے قریب ہوتی ہیں۔ مگر پاکستان میں ایسا نہیں ہے۔
۹۔ انگریزوں نے جان بوجھ کر اپنے دورِ حکومت میں مسلم اکثریتی علاقوں میں کارخانے اور فیکٹریاں نہ لگائیں۔ تاکہ مسلمان صنعت و حرفت میں ترقی نہ کر سکیں۔

صنعتی پسماندگی کے اسباب

پاکستان کی صنعتی پسماندگی کے اہم اسباب درج ذیل ہیں۔

۱۔ **سرمایہ کی کمی:** پاکستان میں سرمایہ مہیا کرنے والے مالی اداروں کی کمی رہی ہے۔ اس لئے سرمایہ کاری کے لئے وافر مقدار میں دولت میسر نہیں آ سکتی۔ یہ مالی کمزوری صنعتوں کے قیام میں رکاوٹ بنتی ہے۔

۲۔ **ماہرین کی کمی:** ہمارے ہاں فنی تعلیم کا معیار بڑا پست ہے۔ جس سے اعلیٰ درجے کے ماہرین تیار نہیں ہو رہے۔ فنی عملہ اور ہنرمند کاریگر ہر شعبے کے لئے درکار ہیں۔ یہ کمی تب پوری ہو سکتی ہے۔ اگر فنی تعلیم کو نظام تعلیم کا حصہ بنا دیا جائے۔

۳۔ **زرِ مبادلہ کی کمی:** ہماری برآمدات بہت کم ہیں۔ اور برآمدات سے ہی زرِ مبادلہ کمایا جاتا ہے۔

۴۔ **معدنیات کی کمی:** ہمارے ہاں کوئلہ، لوہا، تیل وغیرہ بہت کم مقدار میں دریافت ہوا ہے۔

۵۔ **ذرائع نقل و حمل کی کمی:** قصبوں اور دیہات کی اکثریت مناسب ذرائع آمدورفت سے محروم ہے۔ صنعتی ترقی کے لئے آسان اور تیز ذرائع نقل و حمل کا ہونا ضروری ہے۔

۶۔ **اجارہ داری:** صنعتوں پر چند لوگوں کی اجارہ داری ہے۔ جو کہ قیمتوں میں آئے دن اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ جب کہ معیار میں اضافہ نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ ہماری مصنوعات بیرونی اشیاء کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

۷۔ **منصوبہ بندی میں عدم توازن:** غیر متوازن صنعتی منصوبہ بندی سے بعض کم اہم صنعتیں قائم کر دی گئیں جب کہ بعض بہت سی اہم صنعتوں کو نظرانداز کر دیا گیا۔ اس سے صنعتی ترقی غیر متوازن ہو گئی ہے۔ اور ملک ابھی تک بعض اشد ضروری صنعتوں سے محروم ہے۔

۸۔ **غیر ملکی اشیاء سے مقابلہ:** برطانیہ، امریکہ، جرمنی اور جاپان وغیرہ سے مسلسل مال کی درآمد سے ہماری مصنوعات ان کا مقابلہ نہیں کر پاتیں جن کی وجہ سے ہماری مصنوعات فیل ہو جاتی ہیں۔

۹۔ **قرضے کی سہولت کا فقدان:** چھوٹے صنعت کاروں کو قرضے کی سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ جب کہ صنعتوں کے قیام کے لئے بڑی بھاری رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے مالی اداروں اور بنکوں کی ضرورت ہے جو تجربہ کار صنعت کاروں کو بڑی بڑی رقمیں دے کر انہیں اس قابل بنائیں کہ وہ صنعتی ترقی کے لئے اہم اقدام کر سکیں۔

۱۰۔ **محدود ملکی منڈی:** ہمارے ہاں مصنوعات کی کھپت بہت کم ہے جب کہ بیرون ملک منڈیاں تلاش کرنے کے لئے مدت اور محنت درکار ہوتی ہے۔ اس سے صنعت کاروں کی حوصلہ افزائی کی بجائے حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور یہ چیز صنعتی ترقی میں رکاوٹ بنتی ہے۔

۱۱۔ **منصوبہ بندی کا فقدان:** منصوبہ بندی کرتے وقت بعض اہم صنعتوں کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے جس سے ملک کو اتنا فائدہ نہیں ہوتا جتنا ہونا چاہئے۔

۱۲۔ **سیاسی عدم استحکام:** سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے حکومتیں صنعتی ترقی کی بجائے اپنے اقتدار کو بچانے کی کوشش میں معروف رہتی ہیں۔ جس سے صنعتی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

۱۳۔ **جاگیردار اور زمیندار:** پاکستان میں سب سے زیادہ دولت مند طبقہ جاگیرداروں اور زمینداروں کا رہا ہے جنہوں نے صنعتی ترقی کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔

۱۴۔ **غیر ملکی ماہرین:** صنعتوں کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے لئے غیر ملکی ماہرین کی ضرورت پیش آتی رہی جن کو ملکی ترقی سے زیادہ اپنے معاوضوں سے دلچسپی رہی۔

۱۵۔ **اناج کی درآمد پر زرِ مبادلہ:** غذائی بحران کی وجہ سے ہمیں اکثر اناج باہر سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔ جس سے کثیر زرِ مبادلہ خرچ کرنا پڑتا ہے جس کے باعث صنعتی ضروریات پوری نہ ہو سکیں۔

۱۶۔ **برطانوی پالیسی:** انگریز اپنی مصنوعات کی کھپت کے لئے برصغیر کو ایک منڈی سمجھتے تھے اگر وہ یہاں صنعتیں قائم کرتے تو پھر ان کے مال کی کھپت نہ ہو سکتی لہٰذا انہوں نے اپنی صنعتوں کے فروغ کے لئے برصغیر میں زیادہ صنعتیں قائم نہ ہونے دیں۔

پاکستان کی اہم صنعتیں

پاکستان نے جن صنعتوں میں نمایاں ترقی کی ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ کپڑے کے کارخانے
۲۔ سیمنٹ سازی
۳۔ چینی کے کارخانے
۴۔ کیمیاوی کھاد
۵۔ کاغذ اور گتہ بنانے کے کارخانے
۶۔ شیشہ سازی
۷۔ بناسپتی گھی
۸۔ فولاد سازی
۹۔ مشین سازی کی صنعت
۱۰۔ جہاز سازی
۱۱۔ تیل صاف کرنے کے کارخانے
۱۲۔ دیا سلائی کی صنعت
۱۳۔ جفت سازی اور چمڑے کی صنعت
۱۴۔ کھیلوں کا سامان
۱۵۔ سائیکل سازی
۱۶۔ پٹ سن
۱۷۔ سگریٹ سازی
۱۸۔ ربڑ کی صنعت
۱۹۔ بجلی کا سامان و پنکھے
۲۰۔ آلات جراحی اور سٹین لیس سٹیل کی مصنوعات

پاکستان اب کپڑے اور متعدد اشیائے صرف کی پیداوار میں خود کفیل ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں برآمد بھی کرتا ہے۔ البتہ ابھی فولاد کی صنعت میں خاطر خواہ ترقی نہیں ہو سکی جس کی بڑی وجہ خام لوہے کا میسر نہ ہونا ہے۔ بعض گھریلو صنعتیں بھی ہماری روز مرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ برآمدی مال بھی تیار کر رہی ہے۔ اور اس طرح زر مبادلہ کے حصول کا باعث ہیں۔

پاکستان میں تعلیم کے مواقع اور اہمیت

پاکستان میں معاشی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ بیشتر افراد جاہل اور ان پڑھ

ہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کا رجحان بھی کم ہے۔ اور غریب ماں باپ کے بچے تعلیم حاصل نہیں کر پاتے جب کہ آج کے جدید دور میں افراد کی استعداد کار کا انحصار جسمانی صحت و تندرستی، ہنر مندی اور ٹیکنالوجی سے واقفیت میں پنہاں ہے اللہ تعالیٰ نے تو انسان کو فضیلت ہی علم کی بنا پر عطا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم سے بہرہ ور کرنے کے ساتھ ساتھ تربیت و تنظیم کی راہ بھی بتلائی ہے۔ آج کی جدید دنیا میں انسانی قوت کار اور دار اس کی استعداد کار میں مسلسل اضافہ ہے۔ اور یہ اضافہ جدید تعلیم کی بدولت ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

پاکستانی قوم میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو کسی بھی قوم کو ترقی سے ہمکنار کر سکتی ہیں لیکن اس کے لئے سازگار ماحول اور باقاعدہ منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ پاکستان کے ہنر مند افراد کا ایک بڑا طبقہ (جس میں ڈاکٹرز، انجینئرز، فنی ماہرین، تربیت یافتہ، نیم تربیت یافتہ کاریگر شامل ہیں) دنیا کے دیگر ممالک خصوصاً یورپی ممالک اور خلیجی ریاستوں میں اپنی صلاحیتوں کی بدولت ان ممالک کی صنعتی اور معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں اگرچہ وہ کثیر زر مبادلہ کی فراہمی اور قومی آمدنی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہے کہ ملک بہترین صلاحیتوں والے افراد کی خدمات سے محروم ہو رہا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ایسے افراد کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جائے اور وسائل کو بروئے کار لا کر مزید ہنر مند افراد تیار کئے جائیں۔ تاکہ ملک زیادہ سے زیادہ ترقی کر سکے۔ کارکردگی میں اضافے کے لئے تعلیم اور خصوصاً فنی تعلیم میں ترقی کی ضرورت ہے۔ جس کی طرف بھرپور توجہ نہیں دی گئی۔ اس وقت پاکستان میں خواندگی کی شرح ۲۵ فیصد سے بھی زیادہ ہے لیکن فنی اور ٹیکنیکی تعلیم و تربیت رکھنے والے افراد کی کمی ہے۔ جس کی وجہ سے ملک صحیح طرح سے ترقی نہیں کر سکا۔

چونکہ آج کا دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ اور معاشی ترقی کا حصول سائنس اور ٹیکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا معاشی ترقی کے لئے تعلیم کی کس قدر اہمیت ہے اس کا جواب درج ذیل نکات سے سامنے آ جاتا ہے۔

۱۔ بلند معیار زندگی: زراعت، صنعت، معدنیات و دیگر وسائل تعلیم کی بدولت ہی فروغ پا سکتے ہیں۔ جوں جوں یہ وسائل فروغ پاتے ہیں توں توں شہریوں کی قومی اور فی کس آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس سے معیار زندگی بلند ہوتا ہے۔

۲۔ غربت و افلاس سے چھٹکارا: تعلیم اور خصوصاً فنی تعلیم سے روزگار کے نئے نئے مواقع حاصل ہوتے ہیں جس سے عوام کو غربت، بیروزگاری اور غربت و افلاس سے چھٹکارا حاصل ہوتا ہے۔ پاکستان میں غربت و افلاس کی بنیادی وجہ شرح خواندگی کا کم ہونا ہے۔

۳۔ تعلیم اور ماہرین: تعلیم سے قوم کو کاریگر، ہنرمند، سائنس دان، انجینئرز، ڈاکٹرز اور دیگر میدانوں میں ماہرین میسر آتے ہیں۔ اور ماہرین ہی قوم کی تقدیر بدلنے، معاشی ترقی اور کامیاب منصوبہ بندی کے ذریعے انقلاب لانے کا باعث بنتے ہیں۔

۴۔ ایجادات: یہ تعلیم ہی کا کرشمہ ہے۔ کہ جس کی وجہ سے ماہرین نے آج کی جدید دنیا میں پیغام رسانی اور سفر وغیرہ کے لئے حیرت انگیز ایجادات کی ہیں۔ ہوائی جہاز اور مشینوں کی دریافت نے معاشی ترقی کے میدان میں تہلکہ مچا دیا ہے۔

۵۔ جدید ترقی: آج کی جدید دنیا میں مختلف میدانوں میں حیرت انگیز ترقی تعلیم یافتہ افراد کی بدولت ہی ممکن ہوئی ہے تعلیم یافتہ افراد خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اور خوب سے خوب تر کی تلاش تمام شعبوں میں انقلابی تبدیلیوں کا باعث بنتی ہے۔

۶۔ بین الاقوامی تعاون: آج ایک ملک دوسرے ملک کی مدد کے بغیر جدید ترقی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ اور دوسروں کو مدد تبھی بہم پہنچائی جا سکتی ہے۔ یا دوسروں سے استفادہ تبھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اگر افراد تعلیم یافتہ ہوں کیونکہ دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کا علم پڑھے لکھے لوگوں کو ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا معاشی ترقی کے لئے بین الاقوامی تعاون تبھی فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ اگر زیادہ سے زیادہ افراد تعلیم یافتہ ہوں۔

۷۔ اجتماعی شعور: قومی اور بین الاقوامی سطح پر اجتماعی شعور جس قدر زیادہ ہو گا۔ اتنا ہی قومیں ترقی کریں گی۔ کیونکہ اجتماعی شعور سے ہی بڑے بڑے عالمی سطح کے معاشی اور صنعتی منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے مثلاً یورپ نے یورپی مشترکہ برادری کے ذریعے جو اجتماعی شعور اجاگر کیا ہے۔ اس کی بدولت آج یورپ باقی دنیا پر راج کر رہا ہے۔

۸۔ قومی بچتیں: تعلیم نہ صرف انفرادی سطح پر بلکہ اجتماعی سطح پر اقتصادی ترقی کے لئے لوگوں میں بچت کی اہمیت کو واضح کرتی ہے اگر افراد جاہل اور ان پڑھ ہوں تو وہ اپنا پیسہ فضول کاموں میں ضائع کر دیں گے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ملک کو ترقیاتی منصوبوں پر عمل کرنے کے لئے بیرونی قرضوں پر انحصار کرنا پڑے گا۔

۹۔ ٹیکسوں کی ادائیگی: ملکی ترقی کے لئے وقت پر ٹیکس ادا کرنا بہت ضروری ہوتا ہے اس چیز کو تعلیم یافتہ لوگ ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ کہ ٹیکس ادا کرنے سے قومی دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور ملک زیادہ بہتر طریقے سے ترقی کر سکتا ہے۔

پاکستان میں تعلیم کے مسائل

پاکستان میں تعلیم کے میدان میں ہمیں درج ذیل مسائل کا سامنا ہے۔

۱۔ انگریز کا قائم کردہ نظام: ہمارا نظام تعلیم ایک آزاد قوم کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ انگریزوں کا قائم کردہ ہے جنہوں نے اسے اپنے

سامراجی عزائم کو پورا کرنے کی خاطر ترتیب دیا تھا۔

۲۔ نظریاتی اساس سے لاتعلقی: ہمارا نظام تعلیم نظریاتی تقاضے پورے نہیں کرتا۔ اکثر مضامین مغربی معاشرے کی بنیادی اقدار پر مبنی ہیں۔ جب کہ ہماری نظریاتی اساس اسلام ہے اور اسی میں ہماری کامیابی پوشیدہ ہے۔

۳۔ روزگار کا مسئلہ: ہمارا طالب علم علم حاصل کرنے کو بوجھ سمجھتا ہے اور اس کا مطمع نظر اول و آخر حصول روزگار ہوتا ہے۔

۴۔ فنی تعلیم کی کمی: ہمارے ہاں تعلیم کی کمی ہے۔ تعلیم یافتہ آدمی اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو عار سمجھتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ فنی تعلیم کو عام کیا جائے۔

۵۔ اخلاقی تقاضوں سے عدم مطابقت: ہمارا نظام تعلیم کردار سازی اور اخلاقیات کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ افراد سب سے زیادہ عیاری، مکاری اور ہیرا پھیری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

۶۔ خواتین کے مخصوص فرائض: خواتین کی تعلیم میں انہیں ان کے مخصوص فرائض کے لئے تیار کرنے پر زور نہیں دیا جاتا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا خاندانی نظام آہستہ آہستہ مغربی معاشرے کی طرح تباہ ہو رہا ہے۔

۷۔ ناقص طریقہ امتحانات: ہمارا امتحانات کا نظام انتہائی ناقص ہے ہمارا امتحان دراصل طلبہ کی رٹہ لگانے کی صلاحیت کا امتحان ہے امتحانی کمروں میں نقل کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے۔ امتحانات کا موجودہ طریق کار رشوت ستانی اور طلباء کے دباؤ کے تحت انتہائی گزبڑ کا شکار ہو چکا ہے۔ اسے جڑ سے ہی بدل دینے کی ضرورت ہے۔

۸۔ طالب علم کی تعلیمی بنیاد: ہمارے ہاں پرائمری سطح پر صحیح تعلیمی معیار کے حامل اساتذہ کی بھرتی نہیں کی جاتی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ طالب علم کی تعلیمی بنیاد،

۹۔ محدود تعلیمی وسائل: پاکستان میں تعلیم کو تمام شعبوں سے کم اہمیت دی جاتی ہے۔ کل بجٹ کا محض چار فیصد سرمایہ اس بنیادی ضرورت پر خرچ کیا جاتا ہے پاکستان میں یہ غیر ترجیحی سلوک تعلیمی انحطاط کا باعث بنا ہوا ہے۔

۱۰۔ غیر ملکی زبان: ہمارے ہاں انگریزی میڈیم سکولوں کے ساتھ ساتھ اردو میڈیم سکولوں میں بھی انگریزی لازمی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے اس طرح طالب علموں کی بیشتر ازجی اور وقت انگریزی زبان کو سیکھنے اور سمجھنے میں صرف ہو جاتا ہے۔

۱۱۔ مضامین کا چناؤ: والدین کی اکثریت اپنی اولاد کو ڈاکٹر یا انجینئر بنانا چاہتی ہے اس طرح طالب علموں کو مجبوراً سائنسی مضامین لینا پڑتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے رجحان کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اس طرح ان پر نفسیاتی دباؤ پڑتا ہے اور وہ اپنا کیریئر گنوا بیٹھتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ان خرابیوں کو دور کیا جائے تاکہ ملک کی افرادی قوت قومی ترقی میں مثبت کردار ادا کر سکے ضرورت اس امر کی ہے کہ ملکی ضروریات و وسائل کو مدنظر رکھ کر نظام تعلیم کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ جس سے ملک کی افرادی قوت میں اضافہ ہو تا جائے اور ملک زیادہ سے زیادہ ترقی سے ہمکنار ہو تا جائے۔

پاکستان اور عالم اسلام کے تعلقات

عالم اسلام سے جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کے تعلقات پاکستان کے قیام کے بعد ہی شروع نہیں ہوئے بلکہ یہ بہت پہلے سے موجود تھے غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کے دل دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔ ایسے مفکرین بھی گزرے ہیں جنہوں نے ملت اسلامیہ کے تصور کو اپنا جزو ایمان سمجھا اور ان کی وساطت سے یہ تصور مقبول ہوا۔

قیام پاکستان دراصل اسی جدوجہد کی ایک کڑی تھا۔ جو مسلمان اسلام کی بقاء کے لئے کام کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ قیام پاکستان سے نہ صرف جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کے تہذیبی سرمایہ کی حفاظت بہتر طور سے ہو سکے گی۔ بلکہ ملت اسلامیہ کی تصور کو عملی جامہ پہنایا جا سکے گا۔

یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد عالم اسلام کے ساتھ اس نئی مملکت کے قریب تر تعلقات کو ملی وحدت اور خود اس مملکت کی بقا اور استحکام کے لئے لازمی سمجھا گیا۔ پاکستان نے اپنے قیام کے فوراً بعد مسلم ممالک سے سفارتی' تجارتی اور ثقافتی تعلقات قائم کئے اور حکومت نے سرکاری وفود کے تبادلے کئے۔ مشرق وسطی کے ممالک خصوصاً ایران' ترکی' سعودی عرب' اردن اور مصر سے بہت جلد قریبی تعلقات قائم کئے اور اس کے نتیجہ میں آج پاکستان ایران' ترکی باہمی طور پر علاقائی تعاون برائے ترقی کے معاہدہ کے بطور ہم رشتہ ہیں۔ نیز اسلامی کانفرنس کی تنظیم میں پاکستان ہمیشہ ایک نمایاں کردار ادا کرتا رہا ہے اور اس نے اس تعین کا عملی اظہار کیا ہے کہ جس دن اسلامی ممالک اپنے چھوٹے بڑے اختلافات کو افہام اور تفہیم سے حل کر کے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیں گے اس دن ہر ازم (Ism) کا طلسم ٹوٹ جائے گا اور دنیا پر صرف اسلام کی حکمرانی ہو گی۔

پاکستان تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے ہمدردی' اخلاص اور بھائی چارہ کے احساسات رکھتا

ہے آج وہ کشمیر کے مسلمانوں پر بھارتی مظالم کے خلاف تمام دنیا کو متوجہ کرنے کے لئے کوشاں ہے افغانی بھائیوں کو ایک بڑے عرصہ تک برادرانہ انداز میں پناہ دینے کے فرض بھی اس نے مثالی انداز میں ادا کیا ہے اور اسی طرح آج بوسینیا کے مسلمانوں کی تباہ حالی کو وہ اپنا قومی کرب سمجھتا ہے۔

پاکستان اور سعودی عرب :

سعودی عرب کے ساتھ پاکستان کے انتہائی مستحکم لازوال اور پر خلوص تعلقات کی بنیاد اس امر پر ہے کہ خانہ کعبہ اور روضہ رسول اس سرزمین پر واقع ہیں اور یہ ایسی روحانی و جذباتی وابستگی ہے جس پر سیاسی نشیب و فراز نہ کبھی اثر انداز ہوئے ہیں اور نہ ہوں گے۔

پاکستان اور سعودی عرب کے درمیان تعلقات کا ایک نہایت واضح رخ یہ رہا ہے کہ وقت کے ساتھ ان میں مزید استحکام پیدا ہوتا رہا ہے۔ پاکستان پر جب بھی کوئی کڑا وقت آیا ہے سعودی عرب نے پاکستان کی بھرپور مدد کی ہے۔ مثلاً ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی بھارتی جارحیت کے مواقع پر سعودی عرب نے پاکستان کی ہر ممکن مدد کو اپنا فرض سمجھا ہے۔

پاکستان اور سعودی عرب کے خوشگوار تعلقات کے نتیجہ میں دونوں کے مابین مختلف معاہدے ہوئے ہیں۔ ۱۹۶۷ء کے معاہدہ کے تحت دفاع کے میدان میں پاکستان نے سعودی عرب کو فنی امداد مہیا کرنے کا وعدہ کیا اس کے علاوہ سعودی عرب کی بحری اور ہوائی افواج کو منظم کرنے کی صورت میں بھی پاکستان نے اپنے برادرانہ خلوص کا ثبوت فراہم کیا۔

اقتصادی میدان میں بھی دونوں ممالک قریبی روابط کو ضروری خیال کرتے رہیں ۱۹۷۵ء میں جو مشترکہ بینک قائم ہوا وہ اسی مشترکہ آرزو کا مظہر تھا۔ پاکستان نے سعودی عرب کو اپنے یہاں موجود دوسری سہولتوں اور وسائل سے استفادہ کرنے کی دعوت بھی دی ہے۔ مثلاً سعودی عرب کے طلباء و صاحبان انجینئرنگ اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ دوسروں کو مالی اعتبار سے پاکستان کو آسودہ حال رکھنا اور خصوصاً ارض و دنیاوی آفات پر ممکنہ امداد و اعانت کے لئے اس کا سامنے آنا بھی سعودی عرب کی پاکستان کے ساتھ پر خلوص یگانگت کا ثبوت ہے۔ ۱۹۷۴ء میں سوات کے زلزلہ زدگان کی مدد کے لئے سعودی عرب نے پاکستان کو دس کروڑ روپیہ کا عطیہ دیا

تھا۔

عالم اسلام کے اتحاد کے لئے بھی سعودی عرب اور پاکستان ہمنوا اور ہم قدم رہے ہیں۔ سعودی عرب کے شاہ فیصل نے دو بار پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ اسلامی کانفرنس کا سکریٹریٹ جدہ میں قائم ہے۔ موجودہ خادمین حرمین شریفین شاہ فہد بھی پاکستان آچکے ہیں اور پاکستان کے صدر اور وزیر اعظم بھی سعودی عرب کے دورہ کرتے رہے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ عالمی سیاست اور مختلف امور عالم میں سعودی عرب اور پاکستان کے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔

پاکستان اور ایران :

پاکستان اور ایران یا پاکستان و ترکی کے باہمی تعلقات کی نوعیت کچھ یوں رہی ہے کہ غیر اقوام ان کے مسلسل قریبی اور برادرانہ تعلقات کے پیش نظر پاکستان اور ایران اور ترکی کو مجموعی طور پر ایک ہی قوم اور ایک ہی قوت تسلیم کرنے پر مجبور ہو چکی ہیں۔

ایران اور پاکستان کا برادر اسلامی اور ہمسایہ ملک ہے۔ دینی وحدت اور ہمسا گی نے دونوں کے تعلقات کو برادرانہ ربط و ضبط کی ایک مثال بنائے رکھا ہے اور دونوں کے روابط کا مجموعی ثبوت یہ ہے کہ دونوں نے ملکی اور بین الاقوامی سیاست میں اپنا اپنا سیاسی نقطہ نظر ایک دوسرے کے مماثل رکھا ہے مثلاً دونوں اب سینٹو سے علیحدگی اختیار کر چکے ہیں۔

ایران اور پاکستان کے قریبی مراسم اور تعلقات کی صورت تجارتی تعلیمی اور ثقافتی معاہدوں کے بطور بھی سامنے آئی ہے۔ ان معاہدوں میں علاقائی تعاون برائے ترقی (RCD) بہت اہم تھا جو ۱۹۶۴ء میں طے پایا تھا اور اس میں ان کے ساتھ تیسرا اسلامی ملک ترکی بھی شامل ہوا تھا۔ اب اس معاہدہ کا نام اقتصادی تعاون کی تنظیم (ECO) رکھ دیا گیا ہے۔

ایران اور پاکستان نے اہم سیاسی مسائل میں بھی اشتراک و تعاون کی پالیسی اپنائی ہے مثلاً ایران نے بھی کشمیر پر بھارت کے جبری تسلط کو تسلیم نہیں کیا اور اپنا یہ نقطہ نظر واضح کیا کہ کشمیریوں کو حق خود ارادیت حاصل ہو۔ مسئلہ افغانستان میں خاص طور پر ایران و پاکستان ہم نواز رہے ہیں۔

بھارتی جارحیت کے مواقع بھی ایران کی حدود کو اپنا فرض سمجھا ہے۔ اور پاکستان کی تعلیمی میں ایران نے جس طرح ہاتھ بٹایا ہے اس سے برادرانہ تعلقات کو مزید تقویت حاصل ہوئی

ہے۔ ایران نے پاکستانی اساتذہ اور طلبہ کو وظائف کے ساتھ تعلیمی و تربیتی سہولتیں فراہم کی ہیں اور ان دونوں ممالک نے اپنے خلوص عمل سے ایک دوسرے کے رویوں پر گہرے نقوش قائم کئے ہیں۔

پاکستان اور ترکی :

پاکستان اور ترکی یا پاکستان و ایران کے باہمی تعلق کی نوعیت بھی کچھ یوں رہی ہے کہ غیر اقوام ان تینوں ممالک کو ایک ایسی مجموعی قوت تسلیم کرتی رہی ہے جن کی دینی وحدت ان کے مراسم اور تعلق کو لازوال استحکام دیتی ہے۔

جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لئے ترکی کی اپنی خاص اہمیت رہی ہے پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر انگریزوں کے ہاتھوں ترکی کو پہنچنے والے متوقع خطرات اور ترکی کی خلافت کے تحفظ کے لئے مسلمانان ہند نے تحریک خلافت شروع کی۔ یہ تحریک سیاسی طور پر تو کامیاب نہ ہو سکی لیکن اس نے ترکی کے ساتھ مسلمانان ہند کی جذباتی وملی وابستگی کو مزید مستحکم کر دیا۔ گویا اسی استحکام نے قیام پاکستان کے بعد دونوں برادر اسلامی ممالک کے مراسم کو ایک لازوال حیثیت عطا کر دی۔ اور پھر سفارتی تجارتی دفاعی اور ثقافتی میدانوں میں یہ تعلقات بڑھتے ہی رہے۔

پاکستان اور ترکی کے برادرانہ تعلقات کا مظہر ۱۹۶۴ء کا وہ معاہدہ بنا جو RCD وجود میں آیا۔ اور جو ایک مزید بڑا اسلامی ملک ایران کی شمولیت کے ساتھ طے پایا۔ یہ معاہدہ تینوں ہی ممالک کو ایک دوسرے سے نزدیک تر لانے کا ذریعہ وسیلہ ثابت ہوا آج اسی معاہدہ کو اقتصادی تعاون کی تنظیم ECO کیا جاتا ہے۔

پاکستان اور ترکی کے تعلقات کو استوار کرنے میں جس عنصر نے اہم کردار ادا کیا ہے وہ یہ ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کے مسائل و امور کو حقیقت پسندانہ انداز میں دیکھا اور برتا ہے۔ چنانچہ ایک تو صرف ترکی مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے پاکستان کا ہمنوا رہا ہے تو دوسری طرف پاکستان قبرص کے مسئلہ پر مکمل حمایت کا اعلان کرتا رہا ہے۔ پاکستان نے ہمیشہ ترک قبرصوں پر یونانی ظلم و ستم کی مذمت کی ہے اور ترک قبرصوں کی آزاد ریاست کو تسلیم کیا ہے۔ RCD معاہدہ کے دوران ایران و ترکی کے برادرانہ تعلقات کے کتنے ہی رخ سامنے آتے رہے ہیں۔ مشترکہ مسائل کے حل باہمی اخوت کے فروغ اور بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے

لائحہ عمل کے سلسلہ میں اس ادارہ کی کوششیں نہایت مثبت اور موثر رہی ہیں۔ آزادانہ باہمی تجارت آزادانہ باہمی نقل و حمل قریبی تجارتی روابط مشترکہ مقاصد کی نیز تعلیمی و ثقافتی میدان میں قریبی اشتراک عمل نہ کی اور پاکستان دونوں کے لئے ان کا نصب العین رہا ہے۔ اس تنظیم کے تعلق سے پاکستان اور ترکی دونوں کی پیٹرولیم، تجارت، بینکنگ، انشورنس، سیر و سیاحت اور ہوائی رابطہ و جہاز رانی کو فائدہ پہنچا ہے ایک علاقائی تعاون کی شاہراہ بھی تعمیر ہوئی ہے جس سے کراچی سے انقرہ تک براہ راست رابطہ قائم ہوا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ پاکستان اور ترکی کے عوام میں فکری و عملی یگانگت و اتحاد پیدا ہوتے ہیں۔ ڈاک و تار کی شرح کم ہوئی ہے اور نشر و اشاعت کے ادارے اور خبر رساں ایجنسیاں ایک دوسرے سے تعاون کر رہی ہیں اور طلبہ کو باہمی دوروں کے ذریعہ استفادہ حاصل کرنے کا موقع مل رہا ہے۔

پاکستان اور ترکی کے باہمی روابط کے مختلف مظاہر آج بھی سامنے آتے رہے ہیں مثلاً کچھ عرصہ قبل پاکستان کی موجودہ وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو اور ترکی کی خاتون وزیر اعظم چیلر نے ایک ساتھ بوسنیا کا دورہ کیا ہے اور یہاں کے مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے اقدامات کا تہیہ کیا ہے۔

پاکستان اور مصر :

مصر اپنی قدیم تہذیب و تعلق کے حوالہ سے زمانہ قدیم سے ایک اہم اسلامی ملک رہا ہے۔ مسلمانان ہند نے بھی تہذیب اسلامی کو اپنی بقا کا لازمہ سمجھا ہے چنانچہ مصر اور مسلمانان ہند میں ایک گہرا جذباتی تعلق ہمیشہ سے ہی قائم رہا ہے قیام پاکستان کے بعد مصر اور پاکستان کے تعلقات مذکورہ پس منظر کے ساتھ حقیقی انداز میں قائم ہوئے ہیں اور سفارتی اور تجارتی میدانوں میں دونوں ممالک نے ایک دوسرے کے زیادہ قریب آنے کی بھرپور کوشش جاری رکھی ہے۔

سیاست کے نشیب و فراز بہرحال اپنے اثرات پیدا کرتے ہیں چنانچہ مصر اور پاکستان کے تعلقات کے سلسلہ میں بھی ایک مختصر سا دورہ رہا ہے کہ جب دونوں ملکوں کے مراسم میں گرم جوشی کم ہو گئی تھی لیکن ۱۹۵۹ء کے بعد سے جب صدر پاکستان ایوب خان نے مصر کا دورہ کیا تو غلط فہمیاں دور ہوئیں اور خوشگوار تعلقات کی راہ پیدا ہوئی یہ مصر میں جمال عبدالناصر کا دور تھا۔ جمال عبدالناصر کا دورہ جو ۱۹۶۰ء میں ہوا پاکستان اور مصر کو ایک دوسرے سے زیادہ قریب

لانے کا سبب بنا۔ پاکستان نے مصر کے ساتھ اپنی پرخلوص وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی حمایت کی اور انہیں مادی و فنی امداد فراہم کی نتیجتاً مصر اور پاکستان کے تعلقات زیادہ استوار ہوئے۔

پاکستان نے مصر سے تعلقات قائم رکھنے کے سلسلہ میں مصر کے اپنے مفادات کو سمجھنے کی پالیسی اختیار کی ہے۔ دراصل پاکستان کا یہ لائحہ عمل ہی اس بات کا ضامن ہو رہا ہے کہ مراسم میں غیر ضروری الجھن پیدا نہ ہو یہ اس بات کو اس حقیقت کی روشنی میں بہ آسانی پرکھا جا سکتا ہے کہ جب مصر نے اسرائیل سے تعلقات قائم کئے تو بھی پاکستان نے کسی برہمی کا اظہار نہیں کیا اور حقیقت پسندانہ پالیسی اختیار کئے رکھی اور مصر سے اپنے تعلقات کو اس طرح بھی برقرار رکھا کہ بعض عرب ممالک میں مصر کے مفادات کی نگرانی بھی کی۔

پاکستان، مصر کے ساتھ جو روابط قائم کئے رہا ہے اس کے مثبت اثرات اسلامی سربراہ کانفرنسوں کی کامیابی کی صورت میں بھی سامنے آتے رہے ہیں۔ سن ۱۹۷۴ء میں دوسری اسلامی سربراہ کانفرنس کے موقع پر صدر انور سادات نے پاکستان کی ان کوششوں کا اعتراف کیا تھا اور ان کو سراہا تھا جو وہ عرب مفادات کے لئے کرتا رہا ہے۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول ہیں؟

دراصل کسی ملک کی نظریاتی معیشت ہی ان اصولوں کے تعین کے لئے رہنما ہوتی ہے جو وہ مثلاً اپنی جیسی نوعیت کی ریاستوں اور دوسری مختلف نوعیت کی مملکتوں سے روابط قائم کرنے کے لئے وضع کئے جاتے ہیں۔

اس نقطہ نظر سے پاکستان کی اپنی منفرد نوعیت یہ ہے کہ یہ نہ صرف ایک اسلامی ریاست ہے بلکہ ایک نظریاتی نوعیت بھی رکھتی ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے الفاظ میں یہ صرف اس لئے وجود میں نہیں آئی کہ دنیا کے نقشہ پر ایک اسلامی ریاست کا اضافہ ہو جائے۔ اسلامی ریاستیں تو دنیا میں پہلے سے ہی موجود تھیں پاکستان جس نقطہ نظر کے ساتھ وجود میں آیا وہ یہ تھا کہ اسے قرآن و سنت کے نظام کا آئینہ دار بنا کر ایک مثالی حیثیت دی جائے اور یوں کرہ ارض پر بکھری ہوئی تمام ملت اسلامیہ کو ایک اکائی بنانے اور مستحکم کرنے میں اپنا کردار ادا کر سکے۔

مذکورہ صورت حال میں قیام پاکستان کے بعد خارجہ تعلقات کے لئے اصولوں کا تعین آسان نہ تھا۔ چنانچہ پہلے ان بنیادوں کا تعین ضروری سمجھا گیا جن پر مطلوبہ اصولوں کو وضع کیا جائے اور پھر یہ اصول بروئے کار آکر پاکستان کی خارجہ پالیسی کی خصوصیات کا درجہ حاصل کرلیں۔ اس ضرورت کے تحت جو بنیادیں مقرر کی گئیں وہ یہ تھیں۔

خارجہ پالیسی کے اصولوں کی بنیادیں

(۱) مجموعی طور پر تمام ممالک سے بلا امتیاز مذہب و ملت و نظریات برابری کی سطح پر باہمی عزت و احترام اور رواداری کے تعلقات کا قیام۔

(۲) خصوصی طور پر اسلامی ممالک سے ایسے قریب تر مراسم کا قیام جو بالواسطہ اشاعت اسلام اور اسلامی اقدار کے فروغ کا ذریعہ ہوں۔

ان بنیادوں کی روشنی میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کے جو اصول وضع کئے گئے وہ یہ ہیں۔

خارجہ پالیسی کے اصول و خصوصیات

(۱) امن پسندی کے لئے باعمل رہنا

عالمی سطح پر امن و سلامتی کے قیام کے بغیر کسی کی اپنی داخلی امن کو حتمی بنانا دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ پاکستان نے خارجہ پالیسی کا پہلا اصول یہ وضع کیا کہ وہ ہر اس قوم اور خطہ کا ہمنوا اور شریک ہے جو عالمی سطح پر امن و سلامتی کو ضروری سمجھتا ہے اور عملاً اپنے اس نظریہ کو ثابت کرتا ہے۔ اس اصول کو بروئے کار رکھنے کے لئے خارجہ پالیسی کو جو دو اہم رخ دیئے گئے وہ یہ تھے

(الف) اقوام متحدہ سے تعاون کیا جائے۔ اور جن مقاصد کے تحت اس کا قیام عمل میں آیا ہے۔ ان کے حصول میں پاکستان واجب کردار بھی ادا کرتے رہے۔

(ب) عالمی امن کی کوششوں میں رنگ، نسل، مذہب اور زبان کے امتیاز کے بغیر ان تمام اقوام سے خوشگوار تعلقات قائم کئے جائیں اور رکھے جائیں جو مذکورہ مقصد کے لئے سنجیدگی کے ساتھ عمل اور متحرک ہوں۔

(۲) مساوات اسلامی پر کاربند رہنا

پاکستان اپنی نظریاتی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مساوات اسلامی پر کاربند رہے اور بنی نوع

انسان کو ایک بین الاقوامی برادری تصور کرے۔

(۳) اچھی ہمسائیگی قائم کرنا

جغرافیائی طور پر متصل اور منسلک ممالک دور دراز علاقوں کی بہ نسبت زیادہ ہم آہنگی کا تقاضہ کرتے ہیں۔ چنانچہ پاکستان بھی ہمسایہ ملکوں سے اس دو طرفہ نقطہ نظر کے ساتھ ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں دخل نہ دیا جائے۔ اچھے اور دوستانہ تعلقات قائم رکھے۔

(۴) دھڑے بندی سے بچنا

اس صورت حال نے کہ وسائل کی بہتات کے سبب قوت حاصل کرنے کے بعد دنیا میں دو بڑی طاقتیں (سپر پاورز) نمایاں آتی ہیں اور اس صورت حال میں اپنے مفادات کے تحت قوموں نے کسی نہ کسی سپر پاور کی بالواسطہ برتری کو تسلیم کرلیا ہے' پاکستان ہر قوت سے یکساں تعاون کرتے ہوئے کسی ایک دھڑے سے وابستہ نہ ہو۔

"واضح رہے کہ روس کے ٹکڑے ہونے کے بعد اب عالمی سطح پر صرف امریکہ ہی سپر طاقت کے بطور نمایاں ہے جب کہ دوسری طرف غیر وابستہ ممالک اپنی علیحدہ تنظیم کے لئے کوشاں ہیں اور ساتھ ہی ساتھ تیسری دنیا کے بطور اسلامی ممالک کا اتحاد نمایاں مرحلے تک آگے بڑھ چکا ہے

(۵) ممالک سے معاہدے کرنا

قدرت نے بلاشبہ پاکستان کو کتنے ہی وسائل سے نوازا ہے لیکن ترقی پذیر ہونے کے سبب کتنے ہی شعبوں میں وہ دوسروں کی مدد حاصل کرنے پر مجبور ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ پاکستان دوسرے ممالک خصوصاً اسلامی ممالک سے اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے اور دوسروں کو اپنے وسائل سے فائدہ پہنچانے کے لئے معاہدے کرتا رہے۔

ان اصولوں کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان نے انھیں اختیار کرنے کے بعد اقوام عالم اور خصوصاً مسلم اقوام میں ایک نمایاں مقام حاصل کرلیا ہے اور اپنے تشخص کو نمایاں کرنے کے لئے بطور خاص اسلامی تنظیم کے فروغ کے لئے اپنا مثبت کردار نمایاں طور پر انجام دے رہا ہے۔ عالمی امن اور مساوات کے فروغ کے لئے اس نے ہر جارحیت کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ خصوصاً کشمیر میں بھارتی جارحیت کے خلاف عالمی ضمیر کو بیدار کرنا اپنا فرض

سمجھا ہے اور مجموعی طور پر بعض حلقوں میں پائے جانے والے اس تاثرہ باوجود پاکستان امریکہ کے زیر اثر ہے' وہ اپنی آزاد اور متوازن خارجہ پالیسی کو برقرار رکھنے میں مصروف ہے۔
پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ ہے۔ چنانچہ اس کی خارجہ پالیسی دو بنیادوں پر استوار ہے۔ ان میں پہلی بنیاد یہ ہے کہ مجموعی طور پر تمام ممالک سے باہمی عزت و احترام کی بنیادوں پر رواداری کے روابط قائم ہوں اور دوسری بنیاد یہ باہمی عزت و احترام کی بنیاد یہ ہے کہ یہ اسلام ممالک سے خصوصی برادرانہ تعلقات قائم کرے۔
ان بنیادوں پر جو اصول خارجہ پالیسی کے لئے واضح کئے ہیں وہ یہ ہیں۔
(۱) دنیا میں امن و سلامتی کے قیام کے لئے اقوام متحدہ سے تعاون کیا جائے۔
(۲) عالمی امن کی خاطر' رنگ' نسل اور مذہب و زبان کا فرق کئے بغیر سب قوموں سے خوشگوار تعلقات قائم ہوں۔
(۳) اسلامی نظریہ مساوات کی روشنی میں تمام بنی نوع انسان کو ایک بین الاقوامی برادری تصور کیا جائے اور سب انسانوں کے حق مساوات کو تسلیم کیا جائے۔
(۴) ہمسایہ ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کیے جائیں۔
(۵) ملک کی سلامتی اور عزت کی خاطر سب ملکوں سے اور خصوصاً اسلامی ملکوں سے معاہدے کیے جائیں اور ان سے ہر قسم کے مناسب تعلقات کو استوار کیا جائے۔
(۶) بڑی طاقتوں کی دھڑے بندیوں سے پرہیز کیا جائے اور سب بڑے طاقتوں سے ہر ممکن تعاون کیا جائے۔

ان اصولوں کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ پاکستان ملکی آزادی اور سالمیت کی حفاظت پر یقین رکھتا ہے۔ اور ہر قسم کے بیرونی خطرات سے خود کو بچانا چاہتا ہے۔
حکومت نے عالمی حالات کا جائزہ لے کر اپنی خارجہ پالیسی میں نمایاں تبدیلی یہ کی ہے کہ پاکستان اب صرف مغربی طاقتوں کا حامی اور طرفدار نہیں ہے بلکہ چین سے بھی اس کے خصوصی دوستانہ تعلقات قائم ہیں اور وہ روس سے بھی دوستانہ تعلقات کا خواہاں ہے۔ اسلامی ملکوں مثلاً ایران اور ترکی کے ساتھ تعلقات میں برادرانہ رنگ موجود ہے۔ اور سعودی عرب' اردن اور متحدہ عرب امارات کے ساتھ بھی گہرے برادرانہ مراسم قائم ہیں۔ افغانستان پر روس کی

فوج کشی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا بھی دراصل افغانستان کی اسلامی حیثیت قائم رکھنے میں اس کی اعانت کا مظہر ہے۔ بھارت سے مسئلہ کشمیر حل نہ ہونے اور پاک بھارت جنگوں کے سبب تعلقات زیادہ خوشگوار نہیں رہے۔ تاہم پاکستان ہر موقعہ پر اور ہر طرح برابری کی سطح پر ان تعلقات میں بہتری کی کوشش کی ہے۔ پاکستان تمام ممالک کے ساتھ خواہ وہ اشتراکی ہو یا غیر اشتراکی خوشگوار تعلقات اور امن قائم کا خواہاں ہے۔ سیٹو سے اس کی علیحدگی بھی اس کا ثبوت ہے۔

اقوام متحدہ کا قیام، مقاصد اور کردار

اقوام متحدہ کی ضرورت :

تاریخ گواہ ہے کہ جنگ و امن دونوں ہی کرہ ارض کی نمایاں کیفیت رہی ہے۔ جنگ کی کیفیت جن عناصر کے سبب پیدا ہوئی ہے ان میں نظریہ کی اشاعت' توسیع پسندی اور اقتدار کی ہوس نمایاں رہے ہیں۔ لیکن جنگ کے نتیجہ میں بیشتر مثبت سے زیادہ منفی اثرات سامنے آئے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے نتیجہ میں بھی جو کچھ سامنے آیا تھا وہ کسی طرح انسانیت اور معاشرہ کے لئے فائدہ مند نہ تھا۔
پھر جب دنیا پر دوسری جنگ عظیم مسلط کی گئی تو یہ اپنے تمام منفی اثرات کے ساتھ ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی۔ اس جنگ کے خاتمہ پر جو کچھ پیش نظر تھا اس کی نشاندہی کچھ اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ :

(i) انسان کا تمام تر ذہنی سکون برباد ہو چکا تھا
(ii) معاشرتی زندگی کا کوئی ایک رخ بھی ایسا نہ تھا جو تباہ نہ ہوا ہو
(iii) وہ سب کچھ جہاں زندگی مصروف اور متحرک نظر آتی تھی ویرانوں میں مل چکا تھا
(iv) افلاس' بھوک اور بیماریاں مستقبل کے لئے کھلے خطرات تھے
(v) سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ جن مسائل کے حل کے لئے یہ جنگ جاری رہی تھی وہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر اپنی جگہ برقرار تھے
پس ان تمام اثرات کے تحت ہی تمام اقوام عالم (جنھیں جنگ میں شامل' اقوام بھی شامل

تھیں) اتفاق رائے کے ساتھ پکار اٹھیں کہ اب دنیا کسی اگلی جنگ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اب دنیا اور دنیا والوں کی نجات صرف اور صرف "امن" میں ہے۔

اقوام عالم کی طرف سے ایسا ہی کچھ رد عمل اس وقت بھی سامنے آیا تھا جب پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تھی۔ امریکہ کے صدر ولسن نے آئندہ جنگ کو روکنے کے لئے "لیگ آف نیشنز" قائم کی تھی مگر قبل اس کے کہ حصول مقصد کے لئے پیش رفت کا موقع ملتا دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی تھی

چنانچہ دوسری جنگ عظیم کی ہولناک تباہیوں کے بعد اب امن عالم کے لئے جو آواز اٹھی وہ زیادہ بھرپور تھی۔ امریکہ' برطانیہ' فرانس اور روس جیسے ممالک حصول مقصد کے لئے ہم آواز تھے۔ چنانچہ ان کے اشتراک سے جو ادارہ وجود میں آیا وہ ادارہ اقوام متحدہ (UNO) تھا۔ لندن میں منعقد ہونے والے پہلے اجلاس کے بعد اپریل ۱۹۴۵ء میں اس ادارے نے ایک باقاعدہ حیثیت حاصل کرلی اور تمام اقوام عالم نے حال اور مستقبل کی ضرورتوں کے عین مطابق اس کی رکنیت قبول کرلی۔

مقاصد : (۱) تیسری عالمی جنگ کی روک تھام

بنیادی طور پر اقوام عالم جس حقیقت کی روشنی میں یو این او کے قیام تک پہنچی تھی وہ یہی تھی کہ جنگ مسائل کا حل نہیں ہوتی اور سب کچھ تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ چنانچہ یو این او اقوام متحدہ کا پہلا مقصد یہی قرار پایا تھا کہ تیسری جنگ عظیم کے خطرات کو ختم کیا جائے اور جیسے ہی کوئی ایسا محرک پیدا ہو اس کی روک تھام کی جائے۔

(۲) پسماندہ اقوام کی ممکنہ امداد

جنگ عظیم نے خوشحال اقوام کو پسماندہ بنا دیا تھا اور پسماندہ اقوام کو پسماندہ تر کر دیا تھا۔ چنانچہ یو این او کا مقصد یہ بھی ٹھہرا کہ جو اقوام نسبتاً بہتر حالت میں ہیں وہ نسبتاً ابتر حالت کی قوموں کی مدد کریں تاکہ ان کا زندہ رہنا ممکن ہو اور وہ اپنی کوشش سے اپنے مستقبل کو بہتر بنا سکیں۔

(۳) امن عالم اور اقوام عالم کا باہمی اتحاد

اقوام متحدہ نے جب ایک اور اہم بنیادی ضرورت کو محسوس کیا وہ اقوام عالم کا باہمی اتحاد

تھی اقوام عالم کے قریب تر آنے اور ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے میں وسعت نگاہ پیدا کرنا ہی اس بات کی ضمانت فراہم کر سکتا تھا کہ آئندہ کوئی جنگ رونما نہ ہو۔

(۴) ممبر ممالک کے باہمی نزاعات کا خاتمہ

اقوام متحدہ نے اقوام کو قریب تر لانے کے لئے یہ مقصد بھی اختیار کیا کہ جن چھوٹی بڑی قوموں کے درمیان باہمی نزاعات ہیں انھیں ختم کرایا جائے اور اس بات کی نگرانی کی جائے کہ آئندہ ان کے درمیان باہمی تنازعات کے اسباب جنم لے سکیں۔

(۵) اقوام عالم کے مالی و معاشرتی حالات کی بہتری

اس وقت کہ جب جنگ عظیم دوم ختم ہوئی اقتصادی تباہ حالی بڑی نمایاں تھی۔ چنانچہ ایسی تدابیر و تجاویز اور ان پر عمل ضروری تھا کہ جو قوموں کے مالی و معاشرتی حالات کو بہتر بنانے کی راہ دکھائیں۔ اقوام متحدہ نے باہمی مشاورت سے ایسی منصوبہ بندی کو بھی اپنا مقصد بنایا۔

(۶) غربت' بیماری اور جہالت کا خاتمہ

جنگ عظیم دوم کرہ ارض کے ہر حصہ کے لئے غربت' بیماری اور جہالت کی لعنتوں کے ثمرات دے کر ختم ہوئی تھی۔ یہ تینوں ہی باتیں انسانیت کے لئے بڑا خطرہ تھیں چنانچہ اقوام متحدہ کی تنظیم نے ان اثرات کے جائزہ اور ان کے خاتمہ کے لئے اقدامات کو بھی اپنا مقصد ٹھہرایا۔

(۷) باہمی معاہدوں پر عمل در آمد

کوئی ملک یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ تمام تر وسائل سے مالا مال ہے۔ اگر کسی ملک میں بعض وسائل کی بہتات ہے تو دوسرے ملک میں اس کی کمی ہے چنانچہ ضروریات کی تکمیل کے لئے ایسے معاہدے ضروری ہوتے ہیں جو وسائل کا تبادلہ کر سکیں۔ چنانچہ باہمی تعلق کی فضا قائم رکھنے اور ایک متوازن معیشت کے لئے ضروری ٹھہرا کہ یو این او باہمی معاہدوں کی تکمیل کا بھی ذمہ دار ہے۔

(۸) اقوام عالم کے بنیادی حقوق کا تحفظ

اقوام متحدہ نے بین الاقوامی سطح پر ہر طبقہ و نسل کے بنیادی حقوق کے تحفظ کو بھی اپنا مقصد ٹھہرایا تاکہ عموماً طاقتور کے ہاتھوں کمزوروں کی حق تلفی جنگ اور نفرت کی راہ دیتی ہے۔

اقوام متحدہ کے اہم ادارے

انجمن اقوام متحدہ مندرجہ ذیل اداروں پر مشتمل ہے :-

(۱) سلامتی کونسل (۲) جنرل اسمبلی (۳) اقتصادی و معاشرتی کونسل (۴) مجلس تولیت (۵) بین الاقوامی عدالت (۶) سیکریٹریٹ

(۱) سلامتی کونسل :

یہ انجمن اقوام متحدہ کا بنیادی ادارہ ہے۔ تمام انتظامی اختیارات اسی کو حاصل ہیں۔ اس میں دنیا کی پانچ بڑی طاقتوں یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکہ' روس' برطانیہ' اور چین کی مستقل نشستیں ہیں۔ ان کے علاوہ دس عارضی ممبر بھی ہیں جن کا انتخاب جنرل اسمبلی کے ارکان میں سے دو سال کے لئے کیا جاتا ہے۔

(۲) جنرل اسمبلی :

یہ اقوام متحدہ کی پارلیمنٹ ہے۔ ہر ممبر ملک اس میں پانچ نمائندے بھیج سکتا ہے۔ لیکن ووٹ دینے کا حق صرف ایک کو حاصل ہوتا ہے اس کا اجلاس سال میں عموماً" ایک مرتبہ ہوتا ہے۔ اس میں انجمن کے تمام ممبر ممالک کے نمائندے موجود ہوتے ہیں۔

(۳) اقتصادی و معاشرتی کونسل :

انجمن اقوام متحدہ کا یہ ادارہ بین الاقوامی 'اقتصادی' معاشرتی' تعلیمی' ثقافتی اور صحتی امور کی نگرانی کرتا ہے اس کے ممبران کی تعداد ۲۷ ہوتی ہے جن کا انتخاب جنرل اسمبلی ۳ سال کے لئے کرتی ہے۔

(۴) مجلس تولیت :

یہ مجلس ان علاقوں کے باشندوں کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے جنہیں مکمل خود مختاری حاصل نہیں۔ ایسے ممالک کو کسی ایک ممبر کی نگرانی میں دے دیا گیا ہے۔

(۵) بین الاقوامی عدالت :

بین الاقوامی عدالت انصاف کا صدر مقام (ہالینڈ) ہے یہ عدالت اقوام متحدہ کا سب سے بڑا قانونی ادارہ ہے۔

(۶) **سیکریٹریٹ** : یہ ادارہ اقوام متحدہ کے دفتری نظام کو چلاتا ہے۔ یہ ادارہ ایک سیکریٹری

جنرل اور اپنے عملہ پر مشتمل ہوتا ہے جو نظم و نسق کے لئے ضروری ہے۔

غیر وابستہ ممالک کی تحریک

غیر وابستہ تحریک مختلف ممالک کی ایک بین الاقوامی انجمن کی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔ جس کا پس منظر یہ ہے کہ اپریل ۱۹۵۵ء میں انڈونیشاء کے شہر بنڈونگ میں ایک کانفرنس ہوئی جس کا بڑا مقصد ان ممالک کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنا تھا جو امریکہ' اور روس' دونوں بڑی طاقتوں میں سے کسی کے ساتھ اس طرح وابستہ ہونا پسند نہیں کرتے کہ ان کا اپنا تشخص ختم ہو کر رہ جائے۔ پاکستان نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی۔ اس کانفرنس میں باہمی تعلقات کے پانچ اصول مقرر کئے گئے جن کو "پنج شیلا" کہا گیا۔ وہ اصول یہ تھے۔

(۱) باہمی اقتدار اعلیٰ اور علاقائی خود مختاری کا احترام۔ (۲) جارحیت سے گریز۔

(۳) اندرونی معاملات میں عدم مداخلت۔ (۴) برابری اور مفاہمت باہمی۔

(۶) پرامن بقائے باہمی۔

۱۹۶۱ء میں بلغراد میں ۲۵ غیر وابستہ ممالک کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی۔ غیر وابستہ ممالک کی تحریک نے اب ایک باقاعدہ تنظیم کی صورت اختیار کر لی۔ طے کیا گیا کہ محکوم اقوام کی آزادی کی کوشش کی جائے۔ غیر ملکی افواج کے اڈے ختم کئے جائیں۔ اسلحہ میں کمی کی حمایت کی جائے اور امیر اور تیسری دنیا کے غریب ممالک کے درمیان اقتصادی فرق کو کم کیا جائے۔ بلغراد کے بعد اس تحریک کی کانفرنسیں بالترتیب قاہرہ (۱۹۶۴ء)' بوسکا (۱۹۷۰ء)' الجیرز (۱۹۷۳ء)' کولمبو (۱۹۷۶ء)' ہوانا (۱۹۷۹ء)' اور نئی دہلی (۱۹۸۳ء) میں منعقد ہوئیں۔

پاکستان نے بنڈونگ کانفرنس میں اہم کردار ادا کیا مگر وہ اس تحریک میں اس کے قیام کے وقت شامل نہ ہوا۔ اس لئے کہ اس نے اپنی ضرورتوں کے تحت سینٹو اور سیٹو کے معاہدوں میں شرکت کر رکھی تھی۔ بعد میں جب پاکستان نے اپنی خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کی۔ اور مذکورہ معاہدوں سے علیحدگی اختیار کر لی تو وہ بھی ۱۹۷۹ء میں اس تحریک کا باقاعدہ ممبر بن گیا۔ پاکستان اس پلیٹ فارم سے ممبر ممالک کے سیاسی اقتصادی اور دیگر مسائل میں نہایت موثر پروکالت کرتا ہے۔ اس کی ساتویں کانفرنس میں اس نے افغانستان میں اندرونی شورش اور روسی فوج کی موجودگی سے پیدا شدہ صورت حال پر اپنا موقف واضح انداز میں پیش کیا ہے۔

"علاقائی تعاون برائے ترقی" (RCD)

جواب : پاکستان' ایران اور ترکی کی یہ علاقائی تنظیم جولائی ۱۹۶۴ء میں وجود میں آئی تھی' اور اسے "علاقائی تعاون برائے ترقی" (RCD) کا نام دیا گیا۔ یہ معاہدہ کثیر المقاصد معاہدہ کے طور وجود میں آیا تھا جس کے بنیادی مقاصد میں آزادانہ باہمی تجارت' آزادانہ باہم نقل و حمل' قریبی تجارتی روابط' مشترکہ مقاصد کی منصوبہ بندی' مشترکہ ہوائی سروس جہاز راں سروس کا قیام نیز تعلیمی اور ثقافتی میدان میں قریبی اشتراک وغیرہ شامل تھے۔

اس معاہدہ کا انتظام ایک وزارتی کونسل نے چلایا۔ اس کے علاوہ ایک علاقائی پلاننگ کمیٹی نے بھی کام کیا۔ اس تنظیم نے پیٹرولیم' تجارت' بینکنگ اور انشورنس' نیز سیر و سیاحت' ہوائی رابطہ و جہاز رانی میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ایک علاقائی تعاون کی شاہراہ بھی تعمیر ہوئی جس سے کراچی کا انقرہ سے براہ راست رابطہ قائم ہوا۔ مزید اس تنظیم کے تحت صنعتی منصوبوں کے بطور کھاد کو تیار کرنے کا منصوبہ' آئرن اور اسٹیل کی مصنوعات کے منصوبے اور جہاز رانی' بینک نوٹوں کے کاغذ بنانے کے منصوبے کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

جواب : اسلامی کانفرنس کی تنظیم :

مسلمانان عالم کی دیرینہ خواہش تھی کہ ایک ایسا پلیٹ فارم قائم کیا جائے جس پر تمام اسلامی ممالک اکٹھے ہو کر اپنے مشترکہ مسائل کو حل تلاش کریں باہمی اخوت کو بڑھائیں اور عالم اسلام کو درپیش بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے لائحہ عمل تیار کریں۔ اگست ۱۹۶۹ء میں یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو آگ لگادی اس سانحہ نے پوری دنیا کے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا اور اسلامی سربراہی کانفرنس بلانے پر زور دیا گیا۔ اس مقصد کے لئے عرب وزرائے خارجہ کی کانفرنس بلائی گئی جس نے یہ تجویز کی حمایت کی کہ اس صورت حال پر غور کرنے کے لئے اسلامی ممالک کے سربراہان کی کانفرنس منعقد کی جائے اس کانفرنس کی انعقاد کی ذمہ داری سعودی عرب اور مراکش کے وزرائے خارجہ کے سپرد کی گئی انہوں نے باہمی مشورے سے ایک سات رکنی کمیٹی بنائی تاکہ اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد کی جاسکے۔ اس کمیٹی نے اسلامی ممالک کی حکومتوں سے مشورے کے بعد ستمبر ۱۹۶۹ء میں اسلامی سربراہی کانفرنس بلائی۔ اس طرح اسلامی کانفرنس کا قیام عمل میں آیا اور مقاصد کے بطور جن امور کا تعین کیا گیا وہ یہ تھے :

(i) مشترکہ درپیش مسائل کے حل کے لئے متحد ہو کر کوشش کی جائے۔

(ii) باہمی اخوت اور رواداری کو آگے بڑھایا جائے۔

(iii) عالم اسلام کو درپیش اور متوقع خطرات کے لئے متفقہ لائحہ عمل تیار کیا جائے۔

(iv) اقتصادی مسائل کو مشترکہ کوششوں سے حل کیا جائے۔

(v) پوری دنیا کے مسلمانوں کا معیار زندگی بلند کیا جائے۔

اسلامی کانفرنس کا سب سے اعلیٰ ادارہ سربراہوں کی کانفرنس ہے۔ اسلامی سربراہوں کی کانفرنس ہر تین سال بعد ہوتی ہے دوسرا اہم اجلاس وزرائے خارجہ کی کانفرنس ہے جس کا سال میں کم از کم ایک اجلاس ہوتا ہے۔

اسلامی کانفرنس کا صدر دفتر سعودی عرب کے شہر جدہ میں قائم ہے۔ سیکریٹری جنرل اس کا انتظامی سربراہ ہے۔ اسلامی کانفرنس کے پہلے سیکریٹری جنرل ملائیشیا کے سابق وزیر اعظم ٹنکو عبدالرحمان تھے۔ اسلامی کانفرنس نے کئی ذیلی تنظیمیں قائم کی ہیں۔ ان میں چند کے نام یہ ہیں۔

(۱) اسلامی ترقیاتی بنک۔ (۲) بین الاقوامی خبر رساں ایجنسی۔

(۳) اسلامی ممالک کے دارالخلافوں کی تنظیم۔ (۴) اسلامی ریاستوں کی براڈ کاسٹنگ کی تنظیم۔

(۵) اسلامی اتحاد فنڈ۔ (۶) القدس فنڈ۔

اس کے علاوہ اسلامی عدالت انصاف قائم کرنے کا منصوبہ بھی زیر غور ہے۔

پاکستان اور اقوام عالم

(۱) امریکہ (۲) روس (۳) چین

پاکستان اور امریکہ

جواب : پاکستان اور امریکہ کے مابین ایک طویل عرصہ تک اچھے تعلقات برقرار رہے۔ پاکستان امریکہ کے ساتھ دفاعی معاہدات میں بھی شریک تھا۔ امریکہ نے پاکستان کی فوجی اور اقتصادی امداد کی۔ پاکستان نے بھی بین الاقوامی معاملات میں کھل کر امریکہ کا ساتھ دیا لیکن پاکستان کی امریکن نواز پالیسی کے باعث کمیونسٹ بلاک اور بعض غیر جانب دار ممالک پاکستان کے خلاف ہو گئے۔ دوسری طرف ڈیموکریٹک پارٹی کے برسر اقتدار آنے کے بعد امریکی پالیسی میں تبدیلی واقع ہوئی۔ بھارت نے چین کا ہوا کھڑا کر کے امریکہ سے وسیع پیمانے پر جنگی ساز و سامان کی امداد حاصل کی۔ اس طرح امریکہ نے اتحادی اور غیر اتحادی ممالک کو ایک ہی سطح پر

رکھ دیا۔ فیصلہ پاکستان کو بھی امریکہ کے ساتھ اپنی پالیسی پر نظرثانی کرنا پڑی پاکستان نے چین کے ساتھ تعلقات کو فروغ دیا۔

مشرقی پاکستان کے المیہ کے دوران امریکہ بھی خاموش تماشائی بنا رہا۔ دفاعی معاہدات میں ہمارا حلیف ہونے کے باوجود اس نے ہماری کسی قسم کی مدد نہ کی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد سے پاکستان کی فوجی اور اقتصادی امداد میں تعطل واقع ہوا لیکن افغانستان میں روسی کھلی جارحیت کے بعد اس علاقہ میں طاقت کا توازن بگڑتا نظر آیا تو امریکہ نے پاکستان کی اہمیت کا احساس کیا۔ صدر ریگن نے صدارت پر فائز ہوتے ہی کھل کر پاکستان کی مدد کا اعلان کیا۔ اس وقت امریکہ نے پاکستان کے بارے میں جو پالیسی اختیار کی اس کا پس منظر یہ تھا کہ پاکستان کی فوجی اہمیت کے پیش نظر اس کی امداد کرنا خود امریکہ کے اپنے مفاد میں تھا۔

پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے لئے جو اقدامات کئے گئے ہیں امریکہ نے انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ علاوہ ازیں اس نے ۱۹۵۹ء کے باہمی دفاعی معاہدہ کے تحت پاکستان کی سلامتی کے تحفظ سے متعلق اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کے عزم کا اظہار بھی کیا۔ نیز افغان مسئلہ پر پاکستان مسائل کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ امریکہ نے اقتصادی ترقی اور مسلح افواج کو جدید بنانے کے لئے پاکستان کی ہر ممکن امداد کا بھی وعدہ کیا۔ صدر ریگن نے روس کی طرف سے پاکستان کی علاقائی حدود کی خلاف ورزی کرنے پر اسے انتباہ کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ ایسی صورت میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ تاہم امریکی حکومت میں بعض عناصر پاکستان کے پرامن ایٹمی پروگرام کو شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھتے ہیں جس کے مطابق امریکی امداد کی ترسیل میں رکاوٹ کا امکان موجود رہتا ہے۔ اور ان دنوں پاک امریکن تعلقات ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہیں۔۔۔ پریسلر ترمیم پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو رول بیک کرنے کی متقاضی ہے، جب کہ پاکستان کی حکومتوں کو اس سلسلہ میں امریکہ کا کوئی جبر ہرگز پسند نہیں۔ دوسری طرف حکومت پاکستان نے بارہا اس امر کی یقین دہانی کرائی ہے کہ اس کا ایٹمی پروگرام صرف پرامن مقاصد کے لئے ہے۔ مسئلہ افغانستان سے پیدا شدہ خطرات کے باعث پاکستان کی شمالی سرحدوں کے بہتر دفاع کی خاطر امریکہ اور پاکستان میں پیشگی اطلاع فراہم کرنے والے ہوائی نظام' (اواکس طیارے) فراہم کرنے پر بھی بات چیت ہوتی رہی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر پاکستان کی وہ توقعات

یقیناً پوری نہیں ہوئی ہیں جو اس نے امریکہ سے قائم کر رکھی ہیں وہ یا قائم کرتا رہا ہے۔ بلاشبہ پاکستان امریکہ کا محکوم بن کر نہیں زندہ نہیں رہ سکتا اور اس کی اس سیاست کو بھی خوب سمجھتا ہے کہ وہ صدق دل سے بھارت اور پاکستان کے جنگی توازن کا قائل نہیں۔ ادھر کشمیر میں بھارتی جارحیت پر بھی امریکہ صرف سرسری باتیں کرتا رہا ہے۔ وہ کسی ایسے حل کے لئے جو کشمیریوں کے لئے قابل قبول ہو پاکستان کا کھل کر ساتھ دینے سے کتراتا ہے چنانچہ پاکستان اپنی خودداری اور خودشناسی کے تحت نواز شریف عہد میں بھی اس عزم کا اظہار کرتا رہا ہے کہ وہ روکھی سوکھی کھانا پسند کرتا ہے مگر امریکن مفاد کے تحت امریکہ کے قرضوں سے اپنے ہاتھوں خودکشی گوارا نہیں کر سکتا آج بے نظیر عہد حکومت میں بھی پاکستان اپنی اسی پالیسی پر گامزن ہے اور امریکہ کو جلد یا دیر سے اپنے رویوں پر نظرثانی کرنا پڑے گی۔

پاکستان اور روس :

مغربی ممالک کے ساتھ دفاعی معاہدات میں پاکستان کی شرکت کے باعث روس ایک عرصہ تک پاکستان کے خلاف رہا۔ چنانچہ کشمیر کے معاملہ میں جب بھی حفاظتی کونسل نے منصفانہ قرارداد منظور کی' روس نے اسے ویٹو کر دیا اور اس کے برعکس ہند کے ساتھ روس کے تعلقات بتدریج زیادہ مضبوط ہوتے چلے گئے دونوں ممالک نے فوجی معاہدات کر رکھے ہیں۔ بھارت روس کے گٹھ جوڑ کے باعث ہی پاکستان کو مشرقی پاکستان سے محروم ہونا پڑا۔ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران روس نے ہند کی فوجی امداد کی۔ پاکستان کی حکومت نے پھر بھی سب کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی پالیسی پر عمل جاری رکھا۔ اگرچہ ۱۹۵۸ء کے بعد سے روس کے ساتھ معمولی نوعیت کے کچھ سمجھوتے ہونا شروع ہوگئے تھے اور کراچی اسٹیل ملز سوویت یونین کے تعاون سے تعمیر کی گئی ہے۔ یہ منصوبہ ملک کی اور ہماری ترقی کے لئے مضبوط بنیاد ثابت ہوگی۔

۲۶ اپریل ۱۹۸۲ء کو پاکستان کے درمیان دو طرفہ تعاون کا ایک معاہدہ طے ہوا اس کی منصوبہ بندی کی گئی کہ مطابق سائنس آرٹ تعلیم ثقافت' ذرائع ابلاغ' صحت اور کھیلوں سے متعلق دونوں ممالک کے مابین تعاون کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ مئی میں دونوں ملکوں کے وفود کے ماسکو میں مذاکرات کے نتیجے میں ۵۰ ملین ڈالر کی اشیاء کے تبادلے کے معاہدے پر دستخط ہوئے۔

دونوں ممالک کے مابین تعلقات میں سرد مہری کی ایک بڑی وجہ روس کی افغانستان میں فوجی جارحیت رہی۔ پاکستان کا موقف جنرل اسمبلی قرارداد کے مطابق یہ رہا کہ اس ملک سے غیر ملکی افواج کا انخلا کر کے اس کی خود مختار حیثیت بحال کی جائے۔ تاکہ پاکستان میں آئے ہوئے لاکھوں افغان مہاجرین کی باعزت واپسی ممکن ہو۔ لیکن روس پاکستان پر مجاہدین کی پشت پناہی کا الزام دے کر پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا رہا آج روس کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے ادھر افغانستان میں قومی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ ان بدلے ہوئے حالات میں روس اپنی مرکزیت ختم کرنے کے بعد بجائے خود ایک کمزور صورت حال سے دوچار ہے' لیکن اس صورت حال میں بھی ممکنہ حد تک بھارت کے ساتھ اس کا بھرپور تعاون جاری ہے اور روس کی اس براہ راست اور امریکہ کی بالواسطہ سرپرستی کے ساتھ وہ کشمیر میں اپنی جارحیت کا بازار گرم کئے ہوئے ہے۔ پاکستان چاہتا ہے کہ روس حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرے افغانستان کے محاذ پر شکست کھانے کے بعد اسے انصاف پسندی اور حقیقت پسندی سے یقیناً کام لینا چاہئے۔ پاکستان نے روس کے تقسیم ہونے کے بعد وہاں کی اسلامی حکومتوں سے اچھے روابط کی داغ بیل ڈالی ہے۔ جس سے اس علاقہ میں اہم سیاسی تبدیلی متوقع ہے۔

پاکستان اور چین :

جن ممالک کی سرحدیں پاکستان کے ساتھ ملتی ہیں ان میں چین بھی شامل ہے۔ ۱۹۶۱ء میں جب چین اور پاکستان نے اپنے سرحدی تنازعہ کو پرامن طور پر حل کیا تو پاکستان اور چین کے مابین خوشگوار تعلقات کا آغاز ہوا۔ پاکستان نے چین کو اقوام متحدہ کا رکن بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ امریکہ کے سخت دباؤ کے باوجود پاکستان نے چین کی جمہوری حکومت کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔

مارچ ۱۹۶۵ء میں ایوب خان مرحوم نے چین کا تاریخی دورہ کیا اور دونوں ممالک کے مابین اور سرحدوں کی نشاندہی کے معاہدے پر دستخط ہوئے چین کے وزیر اعظم چو این لائی نے پاکستان کا دورہ کر کے دونوں ممالک کے دوستانہ دوروں اور وفود کی آمد و رفت کا سلسلہ کا آغاز کیا اور نہایت دوستانہ مراسم قائم ہوئے دونوں ممالک میں دوستانہ تعلقات کی بناء پر متعدد ثقافتی اور تجارتی معاہدے طے پائے۔ چین نے ۱۹۶۵ء اور پھر ۱۹۷۱ء کی ایک پاک بھارت جنگ میں پاکستان ـــ

موقف کی بھرپور حمایت کی اور اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر بھرپور کردار ادا کیا۔ چین پاکستان کی دفاعی ضروریات بھی پوری کرنے میں مدد کر رہا ہے۔ ہمارے فوجی و سیاسی وفود کئی مرتبہ چین گئے ہیں۔ پاکستان کی ہوائی سروس نے چین کے لئے باقاعدہ پروازیں شروع کر رکھی ہیں۔ حال ہی میں دونوں ممالک کے مابین دوستانہ تعلقات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا ہے دونوں ممالک کے زعماء نے دورے کر کے دوستانہ تعلقات کو مزید استوار کیا ہے چین نے بین الاقوامی پلیٹ فارم پر پاکستانی تجویز کہ جنوبی ایشیاء کو ایٹم سے پاک علاقہ کے قیام کی پرزور حمایت کی اور افغانستان میں روسی جارحیت کی بھرپور مذمت کی ہے۔

چین نے پاکستان دوستی کا مسلسل اظہار جس مسئلہ پر کیا ہے وہ مسئلہ کشمیر ہے۔ اس نے اس سلسلہ میں ہمیشہ ہر مصلحت سے بے نیاز ہو کر پاکستان کے موقف کی حمایت کی ہے۔ اصولی طور پر چین ہر بالادستی کے خلاف ہے اور اسی نقطہ نظر کے تحت اس نے کبھی اس بات کو پسند نہیں کیا کہ بھارت کشمیریوں پر ان کی مرضی کے خلاف اپنا تسلط جاری رکھے۔

اقتصادی سطح پر بھی چین اور پاکستان میں وقت کے ساتھ قابل قدر تعلقات کو فروغ ملا ہے۔ پاکستان میں ٹیکسلا کا مشین سازی کا منصوبہ چین کے اشتراک و تعاون سے ہی شروع ہوا ہے۔ پاکستان کی اقتصادیات کو چین کے اس تعاون سے یقیناً فائدہ پہنچا ہے۔ جو پاکستان کے لئے چین کے بہی خواہ ہونے کے کھلا مظہر ہے۔ اس کے ساتھ ایسے مواقع پر بھی کہ جب قدرتی آفات وغیرہ کے سبب پاکستان کی اقتصادیات کو دشواری کا سامنا کرنا پڑا ہے چین نے پاکستان کی مدد کو اپنا شعار رکھا ہے۔

پاکستان چین دوستی کا ایک نیا باب شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے ساتھ شروع ہوا ہے۔ اس شاہراہ کی تعمیر میں حوصلہ مند چینیوں نے شریک کار پاکستانیوں کو ایک نیا عزم و حوصلہ دے کر تکمیل کار میں مصروف رکھا ہے۔ دوران تعمیر کتنے ہی چینی اور پاکستانی کارکنوں کو موت کے گھاٹ اترنا پڑا ہے لیکن جانفشانی اور لگن کے ساتھ اس کی تعمیر جاری رہی ہے جس نے تجارتی تعلقات میں تسلسل اور استحکام پیدا کیا ہے۔

مذکورہ بالا تمام صورت حال کی روشنی میں یہ نقطہ نظر یقیناً واضح حقیقت ہے کہ چین اور پاکستان کے درمیان ایسے مثالی تعلقات قائم ہیں جو ہر مصلحت سے بے نیاز ہو کر رواں دواں ہیں۔

معروضیات (خالی جگہ پر کرنا)

پہلا باب : قیام پاکستان

۱) سندھ کو باب الاسلام کہتے ہیں۔
۲) محمد بن قاسم نے راجہ داہر کو سن ۷۱۲ء میں شکست دی۔
۳) ہندوستان میں مسلمان ۷۱۲ء میں دیبل کے مقام پر آئے۔
۴) حضرت داتا گنج بخش کا نام حضرت علی ہجویری تھا۔
۵) حضرت علی مرتدی حضرت لعل شہباز قلندر کے نام سے مشہور ہوئے۔
۶) قائداعظم نے ۱۹۲۷ء میں صوبہ سرحد میں اصلاحات نافذ کرنے کا مطالبہ کیا۔
۷) سن ۱۵۲۶ء میں بابر نے دہلی فتح کر کے سلطنت مغلیہ کی داغ بیل ڈال دی۔
۸) انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ۱۸۸۵ء میں مسٹر ہیوم نے رکھی۔
۹) مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ء میں بمقام ڈھاکہ عمل میں آیا۔ اس جلسہ کے صدر نواب وقار الملک تھے۔
۱۰) مسلم لیگ کے پہلے صدر سر آغا خان تھے۔
۱۱) مسلم لیگ کا پہلا سالانہ اجلاس سن ۱۹۰۷ء میں کراچی میں ہوا۔
۱۲) گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۰۹ء کو منٹو مارلے اصلاحات کا نام دیا گیا۔
۱۳) بنگال سن ۱۹۰۵ء میں تقسیم ہوا اور سن ۱۹۱۱ء میں اس کی تقسیم منسوخ ہو گئی۔
۱۴) پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں لڑی گئی۔
۱۵) جنوبی ایشیا میں مسلمان کئی صدیوں تک حکومت کرنے کے بعد سن ۱۸۵۷ء میں اقتدار سے محروم ہو گئے۔
۱۶) خلافت کانفرنس کے اجلاس میں جو کراچی میں ۱۹۲۰ء میں منعقد ہوا مسلمانوں کے لئے پولیس اور فوج کی ملازمت حرام قرار دی گئی۔
۱۷) سول نافرمانی کے دوران ایک مسلم خاتون نے پنجاب سیکرٹیریٹ سے یونین جیک اتار کر مسلم لیگ کا پرچم لہرایا۔

۱۸) قائداعظم محمد علی جناح ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو پیدا ہوئے۔
۱۹) میثاق لکھنؤ سن ۱۹۱۶ء میں طے پایا۔
۲۰) تحریک پاکستان کی تاریخ میں ۱۹۱۶ء کا سب اہم واقعہ میثاق لکھنؤ تھا۔
۲۱) نہرو رپورٹ ۱۹۲۸ء میں پیش کی گئی۔
۲۲) نہرو رپورٹ کے جواب میں قائداعظم نے اپنے چودہ نکات ۱۹۲۹ء میں پیش کئے۔
۲۳) مسلم لیگ کا اجلاس الہ آباد ۱۹۳۰ء علامہ اقبال کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں انہوں نے تصور پاکستان پیش کیا۔
۲۴) تین گول میز کانفرنسیں ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء کے درمیان منعقد ہوئیں۔
۲۵) جب کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں تو ۱۹۳۹ء میں مسلم لیگ نے یوم نجات منایا۔
۲۶) قرارداد پاکستان ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں منظور کی گئی۔
۲۷) مولوی اے کے فضل الحق نے پیش کی اور اس کی سب سے پہلے تائید چوہدری خلیق الزماں نے کی۔
۲۸) اجلاس مسلم لیگ ۱۹۴۰ء منعقدہ منٹو پارک لاہور کی صدارت قائداعظم نے کی۔
۲۹) منٹو پارک لاہور کا موجودہ نام اقبال پارک ہے۔
۳۰) کرپس تجاویز ۱۹۴۲ء میں سامنے آئیں۔
۳۱) وائسرائے لارڈ ویول نے شملہ کانفرنس جون ۱۹۴۵ء میں طلب کی۔
۳۲) برصغیر کے انتخابات ۱۹۴۵-۱۹۴۶ء نے ثابت کر دیا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔
۳۳) قائداعظم نے اپریل ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگی اراکین کا ایک کنونشن دہلی میں بلایا۔
۳۴) برصغیر میں کیبنٹ مشن مارچ ۱۹۴۶ء میں آیا۔
۳۵) کیبنٹ مشن کے اراکین کی تعداد تین تھی۔
۳۶) مارچ ۱۹۴۷ء میں لارڈ ویول کو واپس بلا لیا گیا اور ماؤنٹ بیٹن وائسرائے بن کر آیا۔
۳۷) ۱۹۴۵ء میں انگلستان میں لیبر پارٹی برسر اقتدار آئی۔
۳۸) برصغیر کو دو الگ الگ ملکوں میں تقسیم کرنے کا اعلان ۳ جون ۱۹۴۷ء کو کیا گیا۔
۳۹) برصغیر کا پہلا مسلم حکمران قطب الدین ایبک تھا۔

۳۰) کانگریس نے ہندوستان چھوڑ دو تحریک سن ۱۹۴۲ء میں شروع کی۔
۳۱) پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے صدر مولانا تمیزالدین خان تھے۔
۳۲) مسلم لیگ کے شملہ وفد کی قیادت سر آغا خان نے کی۔
۳۳) مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی تحریک خلافت کے اہم رہنما تھے۔

دوسرا باب : تاریخ پاکستان

۱) پہلی جنگ عظیم سن ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی اور سن ۱۹۱۸ء تک جاری رہی۔
۲) دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک جاری رہی۔
۳) ۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانوی پارلیمنٹ نے منصوبہ تقسیم ہند منظور کر کے اپنا قانون بنادیا جو قانون آزادی ہند کہلایا۔
۴) پنجاب کی حد بندی ریڈکلف نے گورداسپور، بھارت میں شامل کر کے کشمیر کو بھارت سے ملانے کا راستہ پیدا کیا۔
۵) ۱۹۴۸ء تک سوا کروڑ مہاجرین پاکستان میں داخل ہو چکے تھے۔
۶) نہری پانی کا مسئلہ ۱۹۶۰ء میں سندھ طاس معاہدے کے ذریعہ طے پایا۔
۷) کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی ۹۶ فیصد اور جموں میں مسلمانوں کی آبادی ۷۰ فیصد رہی تھی۔
۸) جنوری ۱۹۴۸ء میں بھارت نے مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل میں پیش کیا۔
۹) سلامتی کونسل نے دو قراردادوں کے ذریعہ کشمیر میں استصواب رائے منظور کیا۔
۱۰) پاکستان کے پہلے گورنر جنرل قائد اعظم تھے۔
۱) پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس کراچی میں ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء کو ہوا۔
۲) شاہجہان نے ۱۶۴۸ء میں دہلی کو آگرہ کی بجائے دارالحکومت بنایا۔
۳) تحریک علی گڑھ کی ابتداء سر سید احمد خان نے کی۔
۴) پہلی مسلم لیگ وزارت سن ۱۹۴۳ء میں سندھ صوبے میں قائم ہوئی۔
۵) آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا پہلا اجلاس ۱۹۳۷ء میں کلکتہ میں ہوا۔
۶) قائد اعظم نے سن ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔
۷) سندھ مسلم لیگ نے ۱۹۳۸ء میں ایک قرارداد منظور کی جس میں مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل مسلم مملکت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

۱۸) داتا گنج بخش پہلے صوفی بزرگ تھے جنھوں نے صوبہ پنجاب میں اسلام پھیلایا۔

تیسرا باب : اسلامی ریاست کا قیام

۱) قرارداد مقاصد مارچ ۱۹۴۹ء میں منظور کی گئی جسے لیاقت علی خان نے پیش کیا۔
۲) محمد علی فارمولا میں مشرقی اور مغربی منتخبہ میں نمائندگی کے لئے برابری کے اصول کی سفارش کی گئی تھی۔
۳) پاکستان کا پہلا آئین ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو نافذ ہوا۔
۴) جنرل محمد ایوب خاں نے ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو اقتدار سنبھالا اور مارشل لاء لگایا۔
۵) پاکستان کا دوسرا آئین ۸ جون ۱۹۶۲ء کو نافذ ہوا۔
۶) ۱۹۶۲ء کے آئین میں مملکت پاکستان کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا۔
۷) اسلامی نظریاتی کونسل ۱۹۶۲ء کے آئین کی رو سے قائم کی گئی۔
۸) پاکستان میں دوسرا مارشل لاء جنرل یحییٰ خان نے ۱۹۶۹ء میں نافذ کیا۔
۹) ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان ہم سے کٹ کر مملکت بنگلہ دیش بن گیا۔
۱۰) پاکستان کا تیسرا آئین ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء کو نافذ ہوا۔
۱۱) بینکوں میں نفع اور نقصان کی بنیاد پر اکاؤنٹ کھولنے کا آغاز یکم جنوری ۱۹۸۱ء سے ہوا۔
۱۲) ۱۹۸۰ء میں پہلی بار سرکاری طور پر زکوٰۃ کا نظام رائج کیا گیا۔
۱۳) پاکستان میں سب سے پہلے عام انتخابات ۱۹۷۰ء میں ہوئے۔
۱۴) پاکستان کے پہلے صدر اسکندر مرزا تھے۔
۱۵) پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان تھے۔
۱۶) اسٹیٹ بینک آف پاکستان ۱۹۴۸ء میں قائم کیا گیا۔
۱۷) پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین تھے۔
۱۸) پاکستان ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو جمہوریہ قرار دیا گیا۔
۱۹) آئین پاکستان ۱۹۶۲ء صدارتی نوعیت کا اور آئین ۱۹۷۳ء پارلیمانی نوعیت کا تھا۔
۲۰) حضرت سید احمد رائے بریلی کے مقام پر پیدا ہوئے۔
۲۱) ہندوستان کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر تھے۔
۲۲) عشر زرعی مقدار کا ۱/۱۰ حصہ ہوتا ہے اور زکوٰۃ ۲ ۱/۲ فیصد سالانہ وضع کیا جاتا ہے۔

چوتھا باب : ارضِ پاکستان

۱) وسعت کے اعتبار سے پاکستان ۲۳ء۵ سے ۳۷ ڈگری عرض البلد کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔
۲) کوہ قراقرم کی اوسط بلندی ۶۰۰۰ میٹر ہے۔
۳) کوہ سفید کی اوسط بلندی ۳۰۰۰ میٹر ہے۔
۴) بلوچستان پلیٹو ۶۰۰ میٹر سے ۹۰۰ میٹر تک بلند ہے۔
۵) دریائے جہلم کے ریتلے علاقے کو تھل کہتے ہیں۔
۶) آئینی طور پر ملک کا سربراہ صدر ہوتا ہے۔
۷) پاکستان کا کل رقبہ ۷۹۶۰۹۶ مربع کلومیٹر ہے۔
۸) درہ خیبر پشاور کو کابل سے ملاتا ہے۔
۹) پاکستان کے صوبہ پنجاب کی آبادی سب سے زیادہ ہے۔
۱۰) پاکستان اور چین کو ملانے والی شاہراہ کو قراقرم یا ریشم کہتے ہیں۔
۱) سپریم کورٹ پاکستان کی اعلیٰ ترین عدالت انصاف ہے اور ہائی کورٹ صوبے کی اعلیٰ ترین عدالت انصاف ہے۔
۲) ہمارے دستور میں وزیر اعظم انتظامیہ کا سربراہ ہے۔
۳) پاکستان کے ۴ قدرتی خطے ہیں۔
۴) پاکستان کا گرم ترین مقام جیکب آباد ہے۔
۵) ہمالیہ پہاڑ تقریباً ۲۴۰۰ کلومیٹر پھیلا ہوا ہے اور اس کی سب سے زیادہ بلند چوٹی کے ٹو ہے۔

پانچواں باب : پاکستان کا کلچر

۱) گندھارا کا ثقافتی مرکز ٹیکسلا تھا۔
۲) لاہور کا قلعہ بادشاہ اکبر نے تعمیر کرایا تھا۔
۳) بادشاہی مسجد لاہور بادشاہ اورنگ زیب کے دور میں تعمیر ہوئی۔
۴) سندھ میں جامع مسجد ٹھٹھہ مغل بادشاہ شاہجہاں کے دور کی یادگار ہے۔
۵) مسلم ہند کے اولین عظیم موسیقار امیر خسرو تھے۔
۶) مغلیہ خاندان میں آخری طاقتور بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر تھا۔

۷) برصغیر میں آزادی کی پہلی جنگ ۱۸۵۷ء میں لڑی گئی۔
۸) کسی قوم کا کلچر اس قوم کی شناخت ہوتا ہے۔
۹) پاکستان کی سب سے قدیم تہذیب پوٹھوہار کے علاقے میں دریافت ہوئی۔
۱۰) مسجد مہابت خان پشاور شہر میں واقع ہے۔
۱) مطالعہ پاکستان سے ملکی ترقی کے لئے ہمیں اپنی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔
۲) برہمن اور کھتری ہندو سماج کی دو اعلیٰ ذاتیں تصور کی جاتی تھیں۔
۳) مارچ اور اپریل کے موسم کو بہار اور ستمبر اکتوبر کے موسم کو خزاں کہتے ہیں۔
۴) ہمایوں دو مصوروں میر سید علی اور خواجہ عبدالصمد کو اپنے ساتھ ایران سے لایا تھا۔

چھٹا باب : پاکستانی زبانیں

۱) پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔
۲) اردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لشکر کے ہیں۔
۳) اردو غزل کا پہلا دیوان قلی قطب شاہ نے مرتب کیا۔
۴) پشتو نظم کے پہلے شاعر امیر کروڑ تھے۔
۵) خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا پشتو زبان کے مشہور شاعر تھے۔
۶) شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست سندھی زبان کے عظیم شاعر تھے۔
۷) سندھی میں قرآن پاک کا ترجمہ اخوند عزیز اللہ نے کیا۔
۸) سوہنی مہینوال پنجاب کی لوک داستان ہے۔
۹) بلھے شاہ اور خواجہ فرید پنجابی زبان کے کلاسیکی شعراء تھے۔
۱۰) بلوچی زبان کی قدیم شاعری کو ایک انگریز ڈیمز نے روشناس کرایا۔
۱) بلوچی زبان کا معیاری رسم الخط اردو حروف تہجی کی بنیاد پر اپنایا گیا ہے۔
۲) قصہ ہیر رانجھا وارث شاہ نے لکھا۔
۳) لوک داستان سسی پنوں کو ہاشم شاہ نے نظم کیا۔
۴) سندھی زبان میں اولیں لیلا کا بند شاہ عبداللطیف بھٹائی کا لکھا ہوا شاہ جو رسالو ہے۔
۵) پشتو کے عظیم شاعر خوشحال خان خٹک ۱۶۱۳ عیسوی میں پیدا ہوئے۔

ساتواں باب : اقتصادی منصوبہ بندی اور ترقی

۱) پہلا پنج سالہ منصوبہ ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۰ء کے لئے تیار کیا گیا۔
۲) پہلا پنج سالہ منصوبہ بیشتر میدانوں میں ناکام رہا۔
۳) پانچواں پنج سالہ ترقیاتی منصوبہ یکم جولائی ۱۹۷۸ء کو اپنایا گیا۔
۴) پاکستان کی تقریباً ۷۰ فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔
۵) اسکارپ ٹیوب ویلوں کی ایک قسم ہے۔
۶) ۱۹۷۲ء کی مردم شماری کے مطابق خواندگی کی شرح ۲۱.۷ فی صد تھی۔
۷) ملک میں شکر تیار کرنے کے ۳۹ کارخانے موجود ہیں۔
۸) پاکستان کی قومی فضائی کمپنی کا نام پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز ہے۔
۹) صوبہ سندھ کے ۳ ڈویژن ہیں۔
۱۰) پاکستان کے دو بڑے ہائیڈرو الیکٹرک ڈیم منگلا اور تربیلا ہیں۔
۱۱) پاکستان کا چھٹا پنج سالہ منصوبہ سن ۱۹۸۳ عیسوی میں شروع کیا گیا۔
۱۲) ۱۹۵۲ء میں سوئی کے مقام پر قدرتی گیس کے ذخائر دریافت ہوئے۔
۱۳) پاکستان کے تعلیمی ادارے ستمبر ۱۹۷۲ء میں جناب ذوالفقار علی بھٹو نے قومی تحویل میں لئے۔
۱۴) کپاس اور چاول پاکستان کی اہم زرعی پیداوار ہیں۔
۱۵) پاکستان کا سب سے بڑا اسٹیل مل کراچی میں واقع ہے۔
۱۶) ۱۹۷۲ء کی مردم شماری کے مطابق پاکستان کی شرح خواندگی ۲۱.۷ فیصد تھی جو ۱۹۸۱ء میں بڑھ کر ۲۶ فیصد ہو گئی۔
۱۷) پاکستان کی دو اہم فصلیں ربیع اور خریف ہیں۔

آٹھواں باب : پاکستان اور عالمی برادری

۱) RCD کا نیا نام (ECO) Economic Cooperation Organization ہے۔
۲) اقوام متحدہ کی داغ بیل ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ڈالی گئی۔
۳) اقوام متحدہ کے بنیادی اداروں کی تعداد ۶ ہے۔
۴) پاکستان ۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ کا ممبر بنا۔

۵) غیر وابستہ ممالک کی پہلی کانفرنس بلغراد میں ۱۹۶۱ء میں منعقد ہوئی۔
۶) پاکستان ۱۹۷۹ء میں غیر وابستہ ممالک کی تحریک کا باقاعدہ رکن بن گیا۔
۷) اسلامی کانفرنس کا صدر دفتر سعودی عرب کے شہر جدہ میں قائم کیا گیا۔
۸) اسلامی کانفرنس کی پہلی سربراہی کانفرنس ۱۹۶۹ء میں رباط میں ہوئی۔
۹) مسلم لیگ کی دوسری سربراہی کانفرنس فروری ۱۹۷۴ء میں لاہور منعقد ہوئی۔
۱۰) مسلم ممالک کی تیسری اور چوتھی سربراہی کانفرنس بالترتیب طائف اور مراکش میں منعقد ہوئیں۔
۱۱) ایران میں اسلامی انقلاب ۱۹۷۹ء میں رونما ہوا۔
۱۲) سن ۱۹۷۴ء میں لاہور میں اسلام سربراہ کانفرنس منعقد کرانے میں سعودی عرب کے شاہ فیصل نے پاکستان کی مدد کی۔
۱۳) آر سی ڈی کا قیام ۱۹۶۴ء میں عمل میں آیا۔
۱۴) ہماری خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول ہمسایوں سے اچھے تعلقات رکھنا ہیں۔
۱۵) ۱۹۵۵ء کی بینڈونگ کانفرنس میں شریک ممالک نے باہمی تعلقات کے پانچ اصول طے کئے جنہیں پنج شیلا کہا جاتا ہے۔
۱۶) علاقائی اقتصادی کونسل کا سکریٹریٹ تہران میں ہے۔
۱۷) پاکستان تمام دفاعی معاہدوں سے الگ ہو گیا ہے اور اب مکمل طور پر غیر جانب دار تحریک میں شامل ہے۔
۱۸) وہ دو ممالک جو پاکستان کے ساتھ مشترک سرحد رکھتے ہیں بھارت اور افغانستان ہیں۔
۱۹) SAARC، South Asian Association for Regional Cooperation کا مخفف ہے۔
۲۰) ٹیکسلا میں بھاری میکینکل کمپلیکس چین کی مدد سے قائم ہوا۔

الکتاب اسٹیشنرز

ہمارے یہاں تمام اسکولز و کالجز کی درسی کتابیں اور [illegible] پروڈکٹ کے تمام آئیٹم (کاپیاں، رجسٹر، نوٹ بکس) اور اقرا علی سیریز ماسٹر گائیڈز بازار سے بارعایت دستیاب ہیں۔

نیز اسکے علاوہ تمام اداروں کی گائیڈز، حل شدہ اور غیر حل شدہ پرچہ جات، مذہبی، معلوماتی ڈائجسٹ، رسائل، آفس اسٹیشنری، اسکول اسٹیشنری، سالانہ ڈائری، تہنیتی (Greetings) کارڈز دستیاب ہیں۔

(الکتاب اسٹیشنرز، مین روڈ لطیف آباد نمبر ۷ حیدر آباد)

ہر وہ کتاب جو آپ پڑھنا چاہیں

شیخ بک ڈپو اینڈ لائبریری

اسلامی، میڈیکل اور انجینئرنگ یونیورسٹی سے متعلق تمام کتب دستیاب ہیں، نیز تمام اسکولز کی استعمال شدہ کتابیں نصف قیمت پر دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ کمپیوٹر و سی ایس ایس، پی سی ایس، بی بی اے، ایم بی اے، سی اے کی کتب بارعایت دستیاب ہیں۔

پروپرائیٹرز

عبدالسلام شیخ محمد رحمن شیخ (محمد یونس شیخ)

0333-2608956/0321-3089027

عقب جامعہ کلاتھ مارکیٹ یونٹ نمبر 8،

لطیف آباد حیدر آباد

آیئے شہداء پاکستان سے عہد کریں!

"تجدید عہد وفا" پاکستان عطیہ خداوندی ہے اس کے قیام میں لاکھوں معصوم مسلمانوں کی شہادت اور ہزاروں ماؤں بہنوں کی عزت و عصمتوں کی ناقابل فراموش قربانیاں شامل ہیں آیئے نظریہ پاکستان اور تقدیس وطن کے لئے اپنے فروعی، لسانی، فرقہ وارانہ اور علاقائی تعصبات اور اختلافات کو ختم کر کے صرف اور صرف پاکستان اور اسلام کی حفاظت کا عہد کریں

پاکستان قائم رہنے کے لئے بنا ہے اور انشاء اللہ قائم رہے گا۔ (فرمان قائد)

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا بیرون دریا کچھ نہیں
اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

STOCKIST

MASTER & MASTER
BOOK DEPOT & BOOK SELLERS

Foujdari Road,
Opp: St. Bonaventure.
Hyderabad.
Ph: 022-2720685
Mob: 0346-3871715

Rs. 70/=